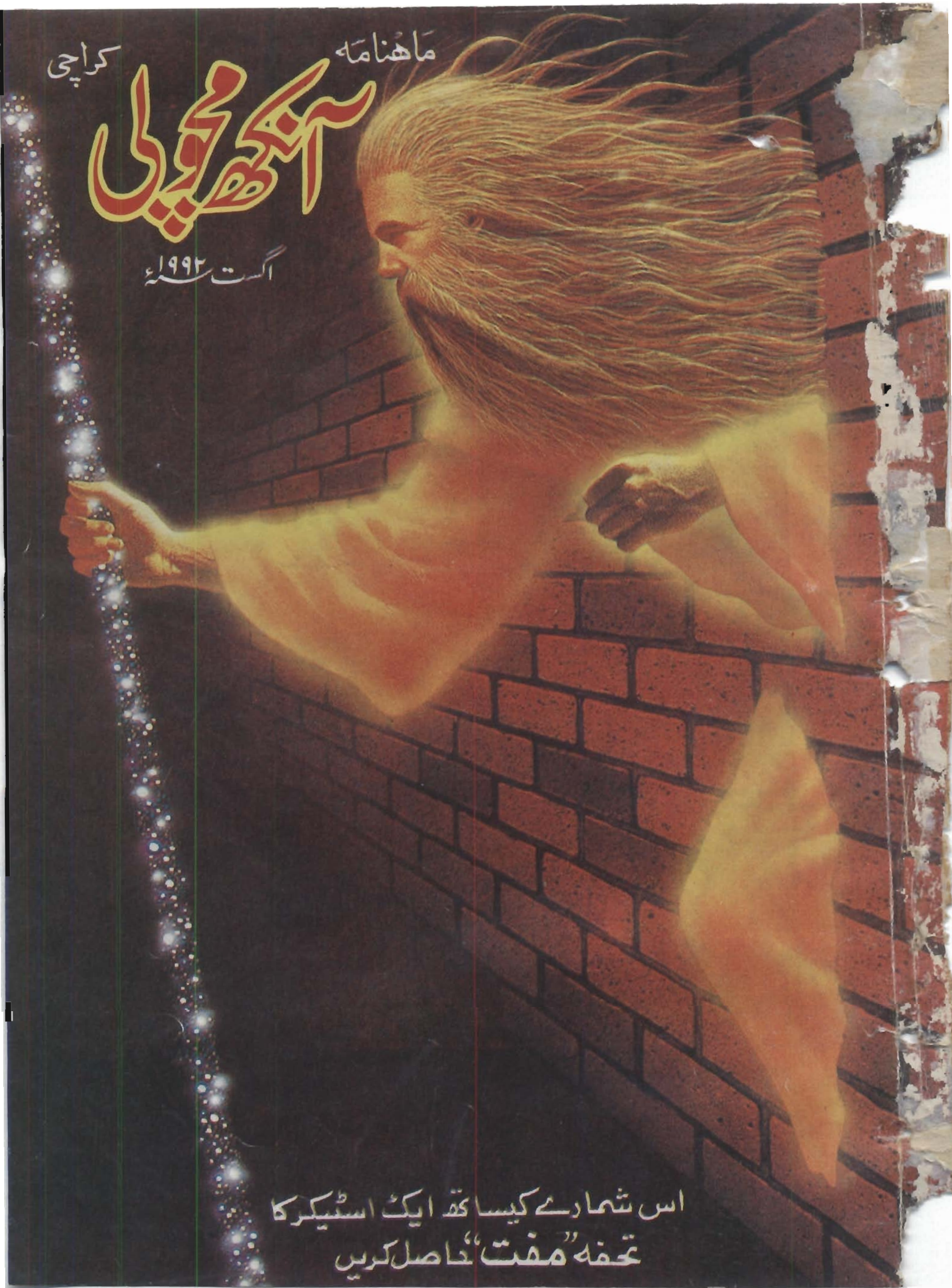
ماھنامہ
آنکھ مچولی
کراچی
اگست ۱۹۹۲ء
اس شمارے کیساتھ ایک اسٹیکر کا
تحفہ "مفت" حاصل کریں

پہلے باٹا® پھر سکول
کینوس شوز کے ساتھ لٹّو
مُفت
لیدر شوز کے ساتھ واٹر گیم
مُفت
پیارے بچو!
سکول پھر سے کھل رہے ہیں۔ نئی کتابیں، نیا بیگ اور نئے باٹا شوز کی خریداری سے بچے پھولے نہیں سمارہے۔ باٹا کے آرام دہ مضبوط اور پائیدار سکول شوز نئی خریداری میں سرفہرست ہیں۔
آج ہی اپنے امی ابو کے ہمراہ باٹا شو سٹور پر تشریف لائیں اور ہر سکول شو کی خریداری پر خوبصورت تحفہ حاصل کریں۔
Bata®
by choice

کتنے اچھے کتنے پیارے
اپنی زمیں کے ننھے تارے

کیا آنکھ مچولی پر صرف آپ کا حق ہے؟

جی نہیں! ہمیں آپ کے ننھے بہن بھائی بھی اُتنے ہی عزیز ہیں جتنے کہ آپ...

آنکھ مچولی کا دلچسپ "مقابلۂ صحت" اُن ہی کے لیے ہے۔
یہ مقابلہ ہر ماہ "ننھے تارے" کے عنوان سے پیش کیا جائے گا۔
اس میں صرف ایک سے تین سال تک کی عُمر کے بچے حصّہ لے سکیں گے۔
اپنے پیارے پیارے اور صحت مند بہن بھائیوں کی رنگین تصاویر جن کا سائز ۴×۶ ہو، ۱۵ اگست ۱۹۹۲ء تک ہمیں بھجوا دیجیے اور نقد انعامات حاصل کیجیے۔

پہلا انعام	۱۰۰۰ روپے
دوسرا انعام	۵۰۰ روپے
تیسرا انعام	۳۰۰ روپے

* یاد رکھیے، تصاویر کے ساتھ کوپن کا آنا لازمی ہے

نام ---------------- ولدیت ----------------
تاریخ پیدائش ---------- وزن ---------- قد ----------
پتا --
----

* یہ مقابلہ وڈورڈ پاکستان کے تعاون سے پیش کیا جارہا ہے

نسل در نسل صحت مند اور
خوش وخرّم بچے
مائیں جانتی ہیں کہ بچے اسی وقت خوش وخرم رہتے ہیں جب وہ صحت منداور مطمئن ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ ۱۴۰ سال سے سمجھدار مائیں اپنے بچوں کو وڈورڈ گرائپ واٹر پلا رہی ہیں۔ اسی لئے ریاحی درد، ہاضمے کی خرابی یا دانت نکلتے وقت مسوڑھوں کی تکلیف میں آپ بھی اپنے بچے کو وڈورڈ گرائپ واٹر دیجیے۔ وڈورڈ گرائپ واٹر ہی بچوں کو تکلیف میں راحت پہنچاتا ہے۔
WOODWARD
بچوں کی صحت وڈورڈ کی روایت
WOODWARD
Interflow

نئی نسل کے اَدب کا بین الاقوامی معیار

ماہنامہ
آنکھ مچولی
کراچی

جلد ۷، شمارہ ۲۰ صفر-ربیع الاوّل ۱۴۱۳ اگست ۱۹۹۲ فون ۱۱۵۸۷

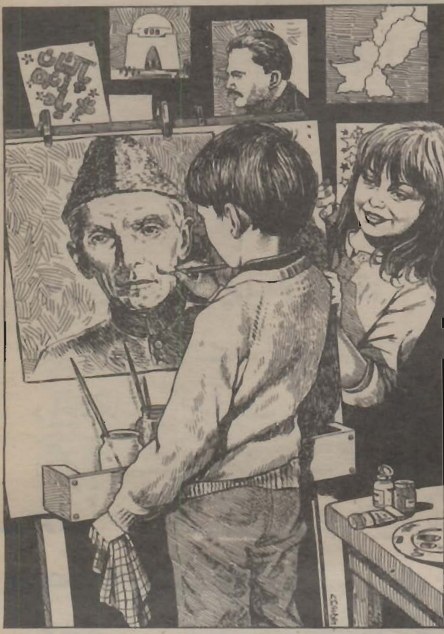

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے
تصدیق شُدہ اشاعت
رُکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

مدیر اعلیٰ

ظفر محمود شیخ

مدیر مسئول

ایم اے فاروقی

مشاورت

مشفق خواجہ امجد اسلام امجد

مدیر اعزازی

طاہر مسعود

مجلس ادارت

منیر احمد راشد، محمد عمر احمد خان

● ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں. پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جا سکتی۔

● ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا

● ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیر سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کیلئے شائع کیا

خط وکتابت کا پتہ : ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی، ۱۰-پی آئی بی کالونی، کراچی ۵ ۷۴۸۰۰ فون : ۷۶۸

ناشر ، ظفر محمود شیخ طابع ، زاہد علی مطبع ، لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ۔ کراچی

قیمت دس روپے
۷ درہم، ۷ ریال

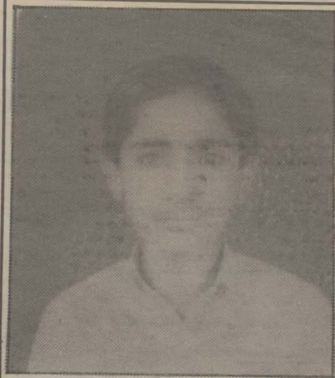

چوہدری افتخار احمد خضر

کامیابی جن کا مقدر ٹھہری

عزیز ساتھیو! آنکھ مچولی کا قیمتی تحفہ "رنگین ٹی وی" پچھلے دو ماہ سے سب کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ گزشتہ شمارے میں ہم نے وہ لکی نمبر شائع کیا تھا جس کو یہ تحفہ دیا جانا تھا۔ یہ نمبر قسمت کے دھنی، گورنمنٹ ہائی اسکول آدھیوال جھنگ، کلاس دھم الف کے چودہ سالہ طالب علم، چوہدری افتخار احمد خضر کے پاس تھا۔ ادارہ اپنے خوش قسمت ساتھی کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔ اور بہت مسرت سے یہ اعلان کرتا ہے کہ عنقریب ایک پروقار تقریب میں ان کی یہ امانت ان کے سپرد کر دی جائے گی۔ ہم اپنے قارئین کو اس تقریب میں شرکت کی پیشگی دعوت دیتے ہیں۔ تقریب کے انعقاد کا اعلان ماہ نامہ آنکھ مچولی کے قریبی شمارے میں کر دیا جائے گا۔

(ادارہ)

حسنِ ترتیب

عنوان	مصنف	صفحہ
تاریخ کے دریچے سے	ادارہ	٨
ماہِ رواں کی پہلی بات	ادارہ	٩
بخدمت جناب	خطوں کے جوابات	١١
حکایاتِ رومی	ماریہ فرخ سید	١٥
ہجرت کی کہانی	حکیم الدین فاروقی	٢٠
انوکھا اور جدید عجائب گھر	سید کاشان جعفری	٢٧
ہمارا عزم (نظم)	عبدالقادر	٣١
آخری شاہکار	کاشف شہزاد	٣٢
مقابلۂ مصوری	ننھے مصور	٣٩
لال پری	سلمان غزالی	٤٠
وہ نگر کہ جہاں (نظم)	مجاہد حسین باسط	٤٨
وہ مقام جہاں چیزیں ...	علی فرہاد حمید	٥٠
عبدالحق سے بابائے اردو تک	طاہر مسعود	٥٣
اپنا گھر	محمد عمر احمد خان	٥٩
پاکستان کوئز	ادارہ	٦٣
کرنا ہمارا مسئلہ کشمیر پر سروے	نائلہ صدیقی	٦٥
شاہین بچہ	منیر احمد راشد	٧١
گلگلے	لطائف	٧٨
عبدل	تمثال مسعود	٨١
تعبیر	مرزا تیمور بیگ	٨٤
کرشمہ	اظہر نیاز	٨٩
چیزوں کی کہانی	آصف فرخی	٩٧
چاندنی رات میں خدا حافظ	چونکو واتاسے	١٠١
پگلی	عبداللہ شیخ گوہر	١٠٤
بے زبان کتاب	مجیب ظفر انوار	١١١
خدا سچا ہے	نثار احمد	١١٦
قلم قبیلے	ننھے ادیب	١١٩
ساتھی بچپن کے	تعارف	١٣١
کتنا بڑوں کا مانو	ادارہ	١٣٢
...	..	..

تاریخ کے دریچے سے

حضرت عمرؓ لوگوں کے صحیح حالات معلوم کرنے کے لئے گلیوں میں گشت کیا کرتے تھے۔ مدینے کے قریب ایک نابینا بوڑھی عورت رہتی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اس کی دیکھ بھال اپنے ذمہ لے لی۔ ایک دن حضرت عمرؓ بڑھیا کی جھونپڑی میں گئے تو انھیں معلوم ہوا کہ ان سے پہلے ہی کوئی شخص بڑھیا کی ضرورت پوری کر گیا ہے۔

حضرت عمرؓ حیران ہوئے کہ وہ کون شخص تھا؟ دوسرے روز حضرت عمرؓ سر شام ہی بڑھیا کی جھونپڑی میں جا پہنچے۔ انھیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک شخص آیا اور بڑھیا کی طرف بڑھا۔

حضرت عمر یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ وہ شخص خلیفۃ المسلمین حضرت ابو بکرؓ تھے

اداریہ

ماہِ رواں کی پہلی بات

آپ نے کبھی سوچا کہ
پاکستان کن لوگوں کے لئے بنا تھا؟
اگر آپ نے اس پہ کبھی غور نہیں کیا تو پھر سنئے کہ
پاکستان بد دیانت اور بے ضمیر لوگوں کے لئے نہیں بنا تھا
پاکستان چوروں، ڈاکوؤں اور اسمگلروں کے لئے نہیں بنا تھا
پاکستان وعدہ خلاف سیاست دانوں، بے ایمان تاجروں اور کم عقل حکمرانوں کے لئے نہیں بنا تھا۔
پاکستان جھوٹے، مکار اور سازشی عناصر کے لئے نہیں بنا تھا۔
پاکستان تعلیم، اخلاق اور تہذیب کو تباہ کرنے والوں کے لئے نہیں بنا تھا۔
لیکن اس کے باوجود
پاکستان میں یہ سب لوگ دندناتے پھر رہے ہیں...... قانون کی انہیں پروا نہیں، عوام سے انہیں خطرہ نہیں اور دل ان کے ملک و قوم کی محبت سے خالی ہیں۔
پاکستان ان کے لئے بنا تھا
جو ایک شریفانہ زندگی گزارنا چاہتے تھے
جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق عمل کرنا چاہتے تھے۔
پاکستان ان لوگوں کے لئے وجود میں آیا تھا
جو ایک مذہب کے ماننے والے تھے
اور اپنے مذہب کے آفاقی اصولوں کو زندہ و تابندہ رکھنا چاہتے تھے
لیکن افسوس کہ
آج پاکستان میں ان لوگوں کے خواب ملیامیٹ ہو رہے ہیں
لیکن جب پرانے خواب ٹوٹ جائیں، بکھر جائیں تو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔
نئے خواب دیکھنے چاہئیں اور ان خوابوں کو حقیقت بنانے کی کوشش کرنی چاہئے۔
ایک دن ایسا ضرور آئے گا
جب پاکستان ان ہی لوگوں کا ہو جائے گا
جن کے لئے یہ بنا تھا۔

آپ کا دوست
ظفر محمود شیخ

میں آنکھ مچولی ہوں

ہر ماہ آپ کے لیے اچھی اچھی کہانیاں،
معلوماتی مضامین، دلکش نظمیں، حسین تصویریں،
نئے اور اچھوتے تحائف لیے
میں آپ کے پاس آتا ہوں

لیکن مجھے دُکھ ہے !
کہ مُلک کے لاکھوں بچے مُجھ سے دُور ہیں
میں اُن تک پہنچنا چاہتا ہوں
میں اُنھیں بھی اپنی کہانیاں اور نظمیں سُنانا چاہتا ہوں
اُن بچوں سے آپ واقف ہیں
یہ آپ کے محلّے اور اسکول میں رہتے ہیں، آپ کے عزیزوں، دوستوں اور جاننے والوں میں شامل ہیں۔
آپ آنکھ مچولی سے اُن کا تعارف کراسکتے ہیں
آپ اُنھیں بھی اپنی طرح آنکھ مچولی کا ساتھی بنا سکتے ہیں
اگر آپ اس کے لیے تیار ہیں
تو مجھے خط لکھیے
آپ میری مدد کریں، میں آپ کی مدد کروں گا
کیوں کہ جو آنکھ مچولی کا دوست ہے، آنکھ مچولی اُس کا دوست ہے۔

پتا

"مُیں آنکھ مچولی ہوں"

۱- پی آئی بی کالونی، کراچی نمبر ۵-۷۴۸۰۰، فون: ۸۷ ۴۱۱۵

بہ خدمت جناب

ارم اقبال، ناظم آباد، کراچی ...... میرے پاس دس گیارہ کہانیاں لکھی رکھی ہیں۔ کیا میں ایک ایک کر کے کہانی ارسال کرنا شروع کر دوں۔

○ ...... ذرا انتظار فرمائیں .... آپ کی پہلے بھیجی ہوئی کہانیوں کا فیصلہ ہو جائے اس کے بعد۔

رفعت غلام، ریاض سعودی عرب ...... پیارے انکل! آنکھ مچولی پڑھ کر بہت مزہ آتا ہے اور کافی چیزوں کا پتا چلتا ہے۔ میں اسکول کا کام کر کے روزانہ رات کو کافی دیر تک اس کا مطالعہ کرتی ہوں۔ میں پاکستان آؤں گی تو آپ کے دفتر میں ضرور آؤں گی۔

○ ...... اچھی بیٹی! آپ کا خط پا کر ہمیں بہت خوشی ہوئی۔ پاکستان آپ کا وطن ہے آپ جب بھی آئیں گی ادارہ آنکھ مچولی آپ کو خوش آمدید کہے گا۔

محمد عقیل صابر، گلشن اقبال کراچی ...... انکل جی! میں نے میٹرک اپنے ابو، امی کے دباؤ میں آ کر سائنس سے کیا ہے۔ میں کامرس پڑھنا چاہتا ہوں جس کی طرف میرا شروع ہی سے رجحان ہے۔ آپ ذرا میری سفارش کر دیجئے تاکہ ابو اور امی مجھے کامرس پڑھنے کی اجازت دے دیں۔

○ ...... آپ نے شاید اب تک سنجیدگی سے ابو اور امی سے اپنی خواہش بیان نہیں کی ہوگی ورنہ وہ اتنے سمجھدار تو یقیناً ہوں گے کہ آپ کی خواہش کا خیال رکھیں۔ اس لئے کہ آپ اسی میدان میں ترقی کر سکیں گے جس میں آپ کا رجحان ہوگا، اور یہ بات آپ کے والدین کو بھی معلوم ہوگی ...... آپ ان سے بات تو کر کے دیکھیں۔

آمنہ معظم بٹ، لاہور ...... میرے ابو بچوں کے رسائل پڑھنے کے خلاف تھے لیکن آنکھ مچولی واحد ایسا رسالہ ہے جو انہیں پسند آیا ہے اور اب اسے پڑھنے کے لئے ہم سے زیادہ ہمارے ابو بے تاب

رہتے ہیں۔
○ ...... یہ رسالے کی تعریف تو نہ ہوئی۔ بھئی رسالہ تو ہم بچوں کے لئے نکالتے ہیں اسے پڑھنے کے لئے سب سے زیادہ بے تاب تو آپ ہی کو ہونا چاہئے۔ کیوں ٹھیک بات ہے نا۔

دیا رام مکوانہ، میر پور خاص، سندھ...... آپ نے سندھی پڑھنے والے بچوں کے لئے ۱۶ صفحات کا علیحدہ سیکشن شروع کیا ہے۔ واقعی بہت اچھا کیا ہے۔ لیکن ادا سائیں! ۱۵۴ صفحات میں سے صرف ۱۶ صفحات سندھی بچوں کے لئے...... کیا یہ بچے ان کو خیرات میں دیئے ہوئے صفحات نہیں سمجھیں گے۔

○ ...... سائیں! آنکھ مچولی ملک بھر کے ساتھیوں کے لئے نکلتا ہے۔ ان کی تعداد جتنی زیادہ ہے اس لحاظ سے ان کے صفحات بھی کم ہیں۔ اور ابھی تو ہم نے یہ سیکشن شروع کیا ہے۔ آگے چل کر اس میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن سائیں! آپ سندھی بچوں کو اتنا مظلوم نہ بنائیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ صرف سندھی نہیں پاکستانی بچے بھی ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کا اس ملک پر اتنا ہی حق ہے جتنا کسی اور کا ہے۔ آپ تو انہیں ایسا بنا کر پیش کر رہے ہیں جیسے خدا نخواستہ وہ کہیں اور سے آئے ہوں۔

احتشام احمد، دینہ، جہلم...... میں نے بہت سے رسائل اور کئی ملکوں کو خطوط لکھے کہ مجھے ڈاک ٹکٹ بھجوادیں لیکن کسی نے بھی میری خواہش پوری نہ کی۔ برائے مہربانی آپ ہی ڈاک ٹکٹ بھجوادیجئے۔

○ ...... میرے عزیز .... بچپن میں ہمیں بھی ڈاک ٹکٹ جمع کرنے کا شوق تھا۔ ایک قلمی دوست نے ہمیں کچھ ڈاک ٹکٹ بھجوائے لیکن بعد میں کسی بات پر ناراض ہو کر ٹکٹ واپس منگوالئے۔ اس کے بعد سے ہم نے اس مشغلے سے ہی توبہ کرلی۔ اس لئے معذرت۔

حسینہ خان، دوبئی...... میں ایک ہندوستانی لڑکی ہوں لیکن ہوں مسلمان .... میں پاکستانی لڑکیوں سے دوستی کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن آپ کے رسالے میں قلمی دوستی کا کالم ہی نہیں ہوتا۔ میری مانیئے تو "روشن مثال" کی جگہ قلمی دوستی کا کالم شروع کردیجئے۔ اس سے بچوں میں دوستی ہوگی اور خود اعتمادی بڑھے گی۔

○ ...... قلمی دوستی کا کالم ہر رسالے میں ہوتا ہے .... ہم نے ایک نیا سلسلہ شروع کیا ہے اس سے بچوں میں محنت کرنے اور نمایاں کامیابی حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوگا۔

شہزاد حیدر خان وریشک، میاں چنوں...... "آنکھ مچولی" گڈ سے بیٹر اور اب بیٹر سے بیسٹ ہو چکا ہے۔
○ ...... تھینک یو، تھینک یو ویری مچ۔

رفاقت اللہ، ڈی آئی خان...... تعریفی خط آپ شائع نہیں کرتے اور تنقید کے لئے رسالے میں کوئی جگہ ہی نہیں چھوڑتے۔ میری مختلف تحریریں دوسرے رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ بس اب یہی ایک رہ گیا ہے لیکن ہم بھی ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں۔

○ ...... پیارے بھائی! دونوں قسم کے خط رسالے میں جگہ پاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم تنقیدی خطوں کو ذرا غور سے پڑھتے ہیں تاکہ ہمیں اپنی خامیوں کو دور کرنے کا موقع مل سکے۔ ہماری دعا ہے کہ خدا آپ کی ہمت کو بلند رکھے۔

عابد محمود، حیدر آباد سندھ

نقل تو ہر جگہ ہوتی ہے۔ ابھی اسی مہینے میں نویں، دسویں والوں کے امتحانات ہوئے، میں نے خود اپنی آنکھوں سے طالب علموں کو نقل کرتے دیکھا۔ ماسٹر صاحب کرسی پر آرام فرمارہے تھے۔ جیسے ہی کوئی ہیڈ ماسٹر کلاس کا راؤنڈ لگانے آتے تو ماسٹر صاحب کرسی سے کھڑے ہو جاتے اور طالب علم اپنی اپنی گائیڈیں چھپا دیتے۔ اگر ہیڈ ماسٹر صاحب کسی طالب علم کو نقل کرتے پکڑ لیتے تو تھوڑی دیر بعد اس کو چھوڑ دیتے۔ انکل میں تو بس یہی کہوں گا کہ آج کا دور پہلے جیسا نہیں ہے۔

آج کے دور میں نویں، دسویں والوں کو انگلش میں اپنا نام تک نہیں لکھنا آتا اور اردو میں خط بھی پڑھنا نہیں آتا۔ یہ بھی سوچنے کی بات ہے!

مریم۔ ہری پور، ہزارہ

میں نے بھی حال ہی میں میٹرک کا امتحان ایبٹ آباد بورڈ سے دیا ہے۔ میرے اسکول کا نام ٹی اینڈ ٹی کالونی گرلز ہائی اسکول ہری پور ہزارہ ہے۔

اس اسکول میں جو کچھ ہوا ہے وہ "محبِ وطن صاحب" کے اسکول سے دو چار قدم آگے ہے۔

اس اسکول کی ٹیچرز یہ کرتی ہیں کہ جب بورڈ کے امتحان شروع ہونے والے ہوتے ہیں تو اپنی رشتے دار طالبات کو اس اسکول میں داخل کروا دیتی ہیں، تاکہ ان کو خوب نقل کروائیں اور وہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہو سکیں۔

اس دفعہ تو حد ہی ہو گئی۔ رشتے دار طالبات کو جب جوابی کاپیاں مل جاتی تھیں تو وہ اس پر پرچہ حل نہیں کرتی تھیں۔ بلکہ جب پرچے کا وقت ختم ہو جاتا اور باقی طالبات چلی جاتیں، اس کے بعد وہ پرچہ حل کیا کرتی تھیں۔

ہمارے آخری پیپر والے دن تو کمال ہی ہو گیا۔ ایک طالبہ کی امی چیکر کے طور پر ہمارے اسکول میں آگئیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جو ٹیچر سپرنٹینڈنٹ تھیں، وہ ان کی (طالبہ کی امی کی) کزن تھیں۔ اس طالبہ کی ایک خالہ ہال سے باہر مدد کے لئے موجود تھیں۔

وزیرِاعظم اور وزیرِ تعلیم روز یہی کہتے ہیں کہ تعلیمی پالیسی کو بہتر بنایا جائے گا۔ نقل کے رجحان کو روکا جائے گا۔ لیکن مجھے تو یہ سب ہوتا نظر نہیں آتا۔ اور لگتا ہے مستقبل ان ہی کا ہے، جن کے پاس سفارش ہے۔

محمد سیف اللہ، شیر شاہ کراچی

آپ نے ایک خط پڑھا جس میں ایک اہم مسئلے کی نشاندہی کی گئی ہے، بحث کی دعوت دی ہے۔ آج صرف وہی ساتھی نہیں بلکہ ہمارے تمام طلبا بھی اسی قسم کے مسائل سے دوچار ہیں۔ جناب والا! کوئی اپنی ماں کے پیٹ سے تربیت یافتہ نہیں پیدا ہوتا بلکہ اس کے اچھے اور بُرے اعمال کے ذمہ دار والدین اور خصوصاً اساتذۂ اکرام ہوتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تمام والدین اور اساتذہ ایسے ہوتے ہیں۔ بلکہ چند گندی مچھلیاں تالاب کو گندہ کر رہی ہیں۔

آج سے چند سال پہلے نقل کا وجود نہیں تھا۔ مگر جب سے ہمارے سیاستدانوں نے تعلیمی میدان کو بھی سیاسی اکھاڑہ بنایا ہے، تب سے ہر طالب علم اپنے ذہن کے بجائے اپنی پارٹی کے کرتا دھرتاؤں پر اعتماد کرتا ہے۔ آج آپ دیکھ لیجئے کہ اساتذہ اکرام تک بے بس ہیں۔ اگر چند اصول پسند اساتذہ ان کو روکنے کی کوشش کریں تو سنگین دھمکیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ دوسروں کی دیکھا دیکھی یہ رجحان ناسور کی طرح طلبا برادری میں پھیل گیا ہے۔ قابلِ استطاعت لوگ تو اپنے نونہالوں کو بڑے بڑے اسکولوں میں داخل کروا کر ان کا مستقبل سنوار دیتے ہیں۔

مگر سفید پوش طبقہ کیا کرے؟

تعلیم بڑے گھرانوں میں محصور ہو چکی ہے۔ گورنمنٹ اسکولوں میں ٹیچرز حضرات یا تو سرے سے ہی نہیں ہیں، یا پھر آنا گوارہ نہیں کرتے۔ امتحان کے دنوں میں خود اپنے طلبا کو نقل کی ترغیب دیتے ہیں۔ بڑوں کے مطابق نئی نسل خراب ہے۔ میں ان سے یہ سوال کروں گا کہ ان کی تربیت آپ نے نہیں کی ہے؟ لہٰذا ہماری اچھائیوں اور برائیوں کے ذمہ دار بھی آپ ہی ہیں۔ خدارا ہمیں صرف رعب جمانے کے لئے نہ استعمال کریں۔ بلکہ ہماری پریشانیوں کو بھی سنیں اور ان کا ازالہ کرنے کی کوشش کریں۔

الیاس محمود نظامی، لاہور

قارئین کے خطوط میں سے ایک دوست کا خط پڑھا۔ اسی طرح کا ایک واقعہ خود میرے ساتھ ایک ہفتہ قبل پیش آچکا ہے۔ جبکہ آٹھویں کے سکالر شپ کے امتحان میں میری اور ایک اور لڑکے کی دوسری اور تیسری پوزیشنوں کو چوتھی اور پانچویں پوزیشن میں بدل دیا گیا۔

رہی نقل والی بات تو یہ معاشرے کا ایک ناسور ہے جو پھیلتا ہی جا رہا ہے۔ لیکن یہ لوگ کب تک نقل کریں گے۔ فرض کیا نقل کر کے ایم۔ اے۔ پاس کر لیا، پھر اس کے بعد تو بیروزگاری ہی اتنی ہے کہ انہیں نوکری ملنا مشکل ہے۔ اگر رشوت دے کے لیں گے تو پھر اپنے ماتحتوں کے سامنے یا اپنے ساتھیوں کے سامنے دبے رہیں گے کیونکہ وہ نالائق ہوں گے۔ تب ان لوگوں کو پتہ چلے گا کہ کتابوں کو پڑھ لیا ہوتا تو آج یہ ذلت نہ ہوتی۔ ساتھ ساتھ جو محنت کرتا ہے اس کا پھل ضرور ملتا ہے۔

علی اکمل تصور۔ قصور

سلام برادر! آنکھ مچولی کے ادارے کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ہر ماہ اس میں مسائل اور ان کے حل پیش کئے جاتے ہیں۔ لیکن جون ۹۲ کے شمارے میں اداریئے کے علاوہ ایک محبِ وطن ساتھی کا خط نظر آیا۔ جس میں مسئلہ تو موجود تھا۔ لیکن اس کا حل نظر نہیں آتا تھا۔ یہ انفرادی مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ تو ایسا اجتماعی مسئلہ ہے کہ جس میں پورے ملک کے ذہین طالب علم مبتلا ہیں۔ اس کا حل انفرادی کوششوں سے ممکن نہیں ہو سکتا۔ پاکستان بنانے کا مقصد ہی تھا کہ اسلامی حکومت میں ہر کام اسلامی قوانین کے تحت ہو گا، لیکن افسوس ایسا ہوا نہیں۔ اور اب ہم ان ناانصافیوں کے شکار ہوتے چلے جا رہے ہیں کہ جن کی طرف میرے ساتھی نے اشارہ کیا ہے۔ اگر ہم نے رشوت، سفارش اور ان جیسی دوسری خرابیوں پر قابو نہ پایا تو پاکستان حاصل کرنے کا مقصد فوت ہو جائے گا اور ہماری کوششیں اور قربانیاں صرف داستان بن کر رہ جائیں گی، ایک ایسی داستان جس کو پڑھنے والا قاری سوائے افسوس کے کچھ نہیں کر سکتا۔

حکایاتِ رومی

انتخاب: ماریہ فرخ سید

ایک دن سلطان محمود غزنوی نے دربار آراستہ کیا۔ تمام امیر وزیر اور دیگر شاہی منصب دار حاضر خدمت تھے، سلطان نے درباریوں کو ایک بیش قیمت موتی دکھا کر پوچھا آپ کے خیال میں اس موتی کی کیا قیمت ہوگی؟

وزیر اعظم نے کہا۔ "حضور...... یہ تو نہایت قیمتی چیز ہے اور اس کی قیمت ایک من سونے کے برابر ہے۔" بادشاہ نے کہا کہ اچھا اسے توڑ ڈالیئے! وزیر اعظم نے معذرت کی کہ حضور...... اس قدر قیمتی موتی کو توڑنا مناسب نہیں۔ بادشاہ نے پھر یکے بعد دیگرے نائب وزیر اعظم اور امیر الامرا سے بھی یہی سوال جواب کیئے۔ انہوں نے بھی موتی کی بے حد تعریف کی اور موتی توڑنے سے انکار کر دیا کہ اس انمول شے کو توڑنے کے حق میں نہیں تھے۔ اس طرح بادشاہ نے باری باری سارے درباریوں سے یہی سوال جواب کیئے۔ انہوں نے بھی یہی جواب دیئے۔ آخر میں بادشاہ نے اپنی لائق اور عزیز غلام ایاز سے بھی یہی پوچھا۔ ایاز نے کہا "سرکار عالی۔ میرے ہر اندازے سے اس موتی کی قیمت کہیں زیادہ ہے۔" بادشاہ نے اس

سے بھی موتی توڑنے کو کہا۔
ایاز نے فوراً تعمیل کی۔ انتہائی قیمتی اور نایاب موتی دیکھتے دیکھتے چُور چُور ہوگیا۔ سارے دربا میں شور مچ گیا۔ سب ایاز کو بُرا بھلا کہنے لگے۔ کہ اس احمق نے اتنا حسین اور انمول موتی توڑ دیا۔
ایاز نے اطمینان سے کہا "آپ فیصلہ کر لیں ! موتی قیمتی تھا یا سلطان معظم کا فرمان؟ آپ سب نے موتی کے مقابلے میں بادشاہ کا حکم توڑنا گوارہ کر لیا۔ آپ کی نظر میں موتی کی قدر و قیمت زیادہ ہے یا بادشاہ کے حکم کی؟"
درباری سخت شرمندہ ہوئے اور ایاز کی قدر بادشاہ کی نظر میں اور بڑھ گئی۔

قدر ایاز

سلطان محمود غزنوی ایاز کو غیر معمولی عزت و اکرام سے نوازتے تھے۔ یہ چیز ایاز کے خلاف دوسرے درباری اُمرا کے دلوں میں حسد کی آگ بھڑکانے کا سبب بن گئی۔
ایک دن ایک درباری نے جُرأت کر کے سلطان سے کہہ ہی دیا کہ سلطان معظم! آپ نے ایاز کو تیس غلاموں سے زیادہ عزت اور مرتبہ عطا کر رکھا ہے، اس کی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک آدمی تیس آدمیوں کے برابر عقل و بصیرت کا مالک کیسے ہو سکتا ہے؟
سلطان نے اس وقت خاموشی اختیار کی۔ چند دن بعد اپنے تیس اُمرا کو لے کر شکار کے لئے روانہ ہوئے۔ ایک بلند مقام سے دیکھا کہ ایک بہت بڑا قافلہ خیمہ زن ہے۔ سلطان نے ایک امیر کو بھیجا کہ معلوم کرے کہ قافلہ کہاں سے آرہا ہے۔ امیر نے آکر بتایا کہ قافلہ ایران کے شہر رے سے آرہا ہے۔ سلطان نے دریافت کیا، قافلہ کدھر جارہا ہے؟ امیر جواب نہ دے سکا کیونکہ اس نے پوچھا ہی نہ تھا۔ سلطان نے دوسرے امیر کو بھیجا کہ معلوم کرو کہ قافلہ کہاں جارہا ہے۔ امیر نے واپس آکر عرض کیا قافلہ یمن کو جاتا ہے۔ سلطان نے دریافت کیا۔ قافلے والوں کے پاس سامان سفر کیا کیا ہے؟
امیر اس کا جواب نہ دے سکا اس نے یہ پوچھا ہی نہیں تھا۔ سلطان نے تیسرے امیر کو بھیجا۔ کہ قافلہ والوں کے پاس کون سا اور کس قدر سامان ہے؟ یہ امیر بھی جا کر واپس آیا اور بادشاہ کو مطلع کیا کہ قافلے کے پاس ہر قسم کا سامان بھاری مقدار میں ہے۔ سلطان نے دریافت کیا کہ یہ قافلہ رے سے کب روانہ ہوا تھا۔ یہ امیر بھی اس سوال کا جواب نہ دے سکا۔ سلطان نے ایک اور امیر کو بھیجا۔ اس نے بتایا کہ قافلہ اس

ماہ کی سات تاریخ کو رَے سے روانہ ہوا تھا۔ سلطان نے پوچھا شہر رَے میں اشیا کی قیمتیں کیا کیا ہیں؟ وہ امیر اس سوال پر دم بخود رہ گیا۔ یہ بھی اس نے قافلے والوں سے پوچھا ہی نہ تھا۔

الغرض ہر امیر اس امتحان میں ناکام رہا۔ ہر شخص صرف اپنے ہی سوال کا جواب لے کر آیا تھا پوری تفصیلات کسی نے دریافت کی ہی نہیں تھیں! اس طرح تمام امیر ناکام رہے۔ بادشاہ نے سب امیروں کو جمع کیا اور کہا"تم کو اعتراض ہے کہ میں ایاز کی زیادہ قدر و منزلت کیوں کرتا ہوں۔ تو سنو تم لوگوں کو معلومات کے لئے بھیجنے سے پہلے ایاز کو ہم نے تمہاری لاعلمی میں بھیجا تھا۔ تم سب تیس افراد جو جوابات اتنے چکر لگا کر لائے ہو، ایاز ایک ہی دفعہ میں تمام معلومات حاصل کر کے لے آیا تھا۔ اب تم کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ ہم ایاز کی قدر زیادہ کیوں کرتے ہیں؟..."

امیر شرم سے پانی پانی ہو گئے اور انھوں نے اعتراف کیا کہ ہم ایاز کی برابری نہیں کر سکتے اس کی یہ قابلیت اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، وہ جس کو چاہے کم دے اور جس کو چاہے بے بہا بخش دے!

انجام پہ نظر

ایک بے حد ضعیف بزرگ ہانپتے کانپتے سنار کی دکان پر پہنچے اور سنار سے کہا۔

"بھائی سنار، ذرا اپنی ترازو دینا، مجھے سونا تولنا ہے۔"

سنار نے کہا، "حضرت! معاف فرمایئے گا۔ میرے پاس چھلنی نہیں ہے۔"

بزرگوار نے کہا، "ارے بھائی میں چھلنی نہیں ترازو مانگ رہا ہوں، ترازو...... سونا تولنے والی ترازو۔"

سنار نے عرض کیا۔ "قبلہ...... سچ عرض کر رہا ہوں۔ میرے پاس جھاڑو بھی نہیں ہے۔"

بڑے میاں نے غصے سے بھنّا کر کہا، "لاحول ولاقوۃ کس احمق سے پالا پڑ گیا۔ میں جھاڑو نہیں ترازو مانگ رہا ہوں۔ دینا ہے تو دو۔ ورنہ یہ الٹی سیدھی مت ہانکو۔"

سنار نے کہا: "حضور! میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں۔ خدانخواستہ میرا مطلب کچھ اور نہیں، کہ آپ کچھ کہیں،میں جواب کچھ اور دوں۔ آپ ہی غور فرمایئے آپ بے حد ضعیف اور نحیف و نزار ہیں۔ ہاتھ پیروں میں دم کہاں بلکہ رعشہ بھی ہے، اور پھر آپ کے پاس جو سونا ہے وہ بھی برادے، چُورے کی شکل میں ہے ٹھوس ڈلی یا زیور نہیں۔ اس لئے ظاہر بات ہے کہ جب آپ ایسے کانپتے ہاتھوں سے سونا تولیں گے تو ہاتھ کانپ جائیں گے، سونے کا چُورا گرے گا پھر آپ مجھ سے جھاڑو مانگیں گے کہ

برادہ جھاڑ کر جمع کر لوں پھر آپ مجھ سے چھلنی طلب فرمائیں گے کہ گرد مٹی سے سونا جھاڑ کر الگ کر لوں۔ اور میری دکان میں چھلنی نہیں ہے، میں نے پہلے ہی آپ کے کام کا انجام دیکھ اور سمجھ لیا تھا۔ بہتر ہے کہ آپ ترازو کسی اور سے مانگ لیجئے۔"

سبق............جو شخص انجام کو سامنے رکھ کر اقدام کرتا ہے وہ دور اندیش اور عقل مند ہے جو صرف ابتدا اور ظاہری حالات دیکھتا ہے۔ وہ احمق ہے! پہلے سے انجام سوچ لینے والا کبھی شرمندہ نہیں ہوتا۔

نیت کی قدر

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ، نبی آخر الزماں علیہ الصلوۃ والسلام کے عاشق صادق اور مؤذن تھے۔ آپؓ اذان میں "حیَ" کو "ہیَ" کہتے تھے۔ بعض صحابہ کرامؓ نے رائے دی کہ اس غلط تلفظ کے ساتھ اذان دینے سے کفار مذاق اڑائیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو علم ہوا تو آپؐ سخت ناراض ہوئے اور ارشاد فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بلالؓ کا ایک بار "ہیَ" کہنا ہمارے سو مرتبہ حیَ حیَ کہنے سے افضل اور مقبول ہے۔!

اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نظر بندے کے دل اور اس کی نیت پر ہوتی ہے اگر زبان سے ٹیڑھے الفاظ نکلیں لیکن ان کے معنی سیدھے ہیں تو یہ ٹیڑھے الفاظ ہی اللہ کو قبول اور منظور ہیں۔ ورنہ اگر تیرے الفاظ سیدھے اور خوش نما لیکن معنی میں اچھے نہیں ہوں تو اللہ کے نزدیک ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔!

اللہ بھارت کا غرور توڑے گا!

جب افغانستان آزاد ہو سکتا ہے تو کشمیر کیوں نہیں آزاد ہو سکتا۔ کشمیر ہمارا ہے اور ہم اسے حاصل کر کے رہیں گے، اللہ تعالیٰ نے جس طرح روس کا غرور توڑا ہے انڈیا کا غرور بھی توڑے گا۔ کشمیر بھی آزاد ہو گا۔ کشمیری عوام اڑتالیس سال سے آزاد ہونے کے لئے تڑپ رہے ہیں؛ یہ عرصہ کم نہیں ہوتا، اگر آپ کو اڑتالیس سال تک ایک بنگلے میں قید رکھا جائے اور ظلم کئے جائیں تو؟ کشمیر کی آزادی ہی ہمارے ملک کو مکمل بنائے گی اور ہمارا ملک انشاء اللہ مکمل ہو گا۔

(اسد اخلاق۔ کراچی)

ننھے تارے

ووڈ ورڈز بے بی مقابلہ

پہلا انعام
۱۰۰۰ روپے

صبا طاہر ـــ فیصل آباد

دوسرا انعام
۵۰۰ روپے

ارم سعید ـــ ملتان

خصوصی انعام
۱۰۰ روپے

کاشف خان ـــ ایبٹ آباد

تیسرا انعام
۳۰۰ روپے

بنت صباحہ ـــ کراچی

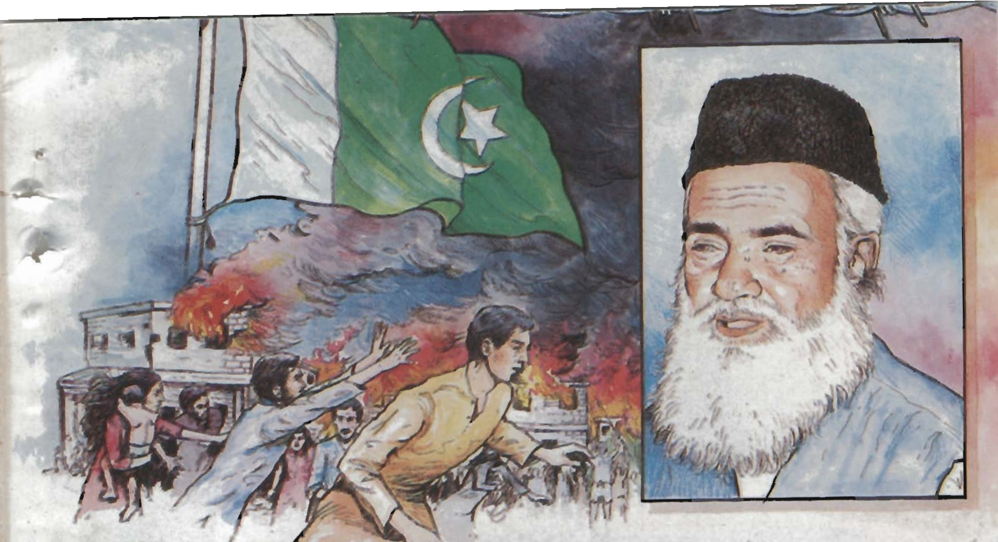

قیام پاکستان کا ایک دردناک سچا واقعہ

آزادی کی قیمت

راوی: حکیم الدین فاروقی ❀ تحریر: اقبال جرمان

میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ خزاں اور بہار کے سارے موسم میری زندگی سے گزر چکے ہیں۔ اتنا کچھ دیکھا ہے کہ اب اس سے زیادہ دیکھنے کی ہمت ہے اور نہ حسرت۔ آج کل کے نوجوان ماشاء اللہ بہت بہادر ہیں۔ اسلحہ رکھتے ہیں، کلاشن کوف چلاتے ہیں۔ ہم نے ایسے خطرناک اسلحوں کا دیکھنا تو دور کی بات، نام بھی نہیں سنا تھا۔ نوجوانوں میں آج کل کوئی اپنے سندھی ہونے پر فخر کرتا ہے تو کوئی خود کو مہاجر کہہ کر مظلوم ظاہر کرتا ہے، کسی کو اپنے پنجابی اور پٹھان ہونے پر اطمینان ہے تو کوئی بلوچ اور سرائیکی پہچان پر زور دیتا ہے۔ اپنے زمانے میں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم صرف اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کیا کرتے تھے۔ مسلمان ہونا کوئی آسان نہیں تھا۔ جو مسلمان ہوتا تھا، اسے اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی تھی۔ ان ہی میں ایک گواہ میں بھی ہوں لیکن میری گواہی ذرا مختلف ہے کیونکہ میں نے پاکستان بننے کے بعد ہندوستانی

مسلمانوں کو تباہ ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ جو کچھ مجھ پر گزری ہے انھیں لفظوں میں بیان کرنا میرے لئے مشکل ہے، لیکن پھر بھی میں کوشش کرتا ہوں۔ یہ سب کچھ سُنانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ نئی نسل کو معلوم ہو کہ پاکستان مسلمانوں کی کتنی بڑی پناہ گاہ ہے۔

پاکستان بننے سے پہلے ہم لوگ موجودہ بھارت کے شہر اورنگ آباد کے ایک چھوٹے سے گاؤں کیج شریف میں رہتے تھے، جس کی کل آبادی ساڑھے چار ہزار کے لگ بھگ تھی۔ اس میں مسلمان ڈیڑھ ہزار تھے جبکہ باقی ہندو اقوام آباد تھیں۔ گاؤں والوں کا اصل پیشہ زراعت تھا چند ایک کو چھوڑ کر تمام مسلمان زمینداری کرتے تھے۔ کیج میں ہمارے خاندان کی ۱۸۴ ایکڑ زمین تھی۔ میرے خاندان میں میرے چچا اور دو بھائی پولیس کے محکمے میں تھے اور میں زائد پٹواری اور مالی پٹیل تھا۔ میرا کام مالیانہ جمع کرنا اور اپنے گاؤں کے سماجی حالات کی روزانہ رپورٹ سرکار کو بھیجنا تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے ہمارے گاؤں میں بڑا سکون تھا۔ ہندو مسلمان مِل جُل کر رہتے تھے لیکن پاکستان کی تحریک شروع ہوتے ہی ہندو آبادی مسلمانوں کے خلاف ہو گئی۔ پہلے پہل تو مسلمانوں کو صرف زبانی دھمکیاں ملتی رہیں لیکن پاکستان بن گیا اور کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔ قائداعظمؒ جب تک زندہ رہے۔ ہندوؤں کو کچھ کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ لیکن قائداعظمؒ کا انتقال ہوتے ہی ہمارے گاؤں میں گڑبڑ شروع ہو گئی۔ ہندوؤں نے جلاؤ گھیراؤ اور لوٹ مار شروع کر دی۔ ہندو مسلم فساد کو روکنے کے لئے تیسرے دن فوج، ٹینک اور بکتر بند گاڑیوں سمیت آگئی۔

اس اثنا میں مسلمان اپنے گھروں کو چھوڑ کر محفوظ مقامات کی طرف نکل گئے تھے۔ صورتحال جب کچھ بہتر ہوئی تو مسلمان اپنے گھروں کو واپس پلٹے لیکن ہندوؤں نے نہتے مسلمانوں کا قتل عام کیا اور مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا دی۔ میں چونکہ زائد پٹواری اور مالی پٹیل تھا اور میرا بھائی پولیس میں تھا لہٰذا ہم دونوں بھائیوں کو پولیس پٹیل رام راؤ نے اپنے دفتر میں فوج کے ہاتھوں گرفتار کرا دیا۔ ہمارے اوپر الزام یہ تھا کہ ہم رضا کار دستوں میں شامل ہیں۔

تقریباً سات سو مسلمان گرفتار کرلئے گئے اور ہمیں بھیڑ بکریوں کی طرح حوالات کے چھوٹے چھوٹے کمروں میں ٹھونس دیا گیا۔

رات بھر تھانے میں بند رہے۔ صبح ہوتے ہی ہمیں حوالات سے نکال کر چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بانٹ کر فوجی کیمپ لے جایا گیا جو تھانے سے تقریباً ۱۲ میل دور تھا۔ سارے لوگوں کے ہاتھ باندھ دیئے گئے۔ پھر ہمارے پیچھے ٹینک اور گاڑیاں لگا دی گئیں اور ہمیں دوڑنے کا حکم دیا گیا۔ میرے گروپ میں تیس بتیس افراد تھے ہم لوگ گرتے پڑتے بھاگ رہے تھے۔ خوف اس بات کا تھا کہ اگر کوئی بھی

سانس لینے کے لئے رکا تو پیچھے دوڑتے ہوئے ٹینک یا گاڑیوں کے نیچے کچلا جائے گا۔ ہم لوگ بڑی طرح ہانپ رہے تھے اور بھاگ رہے تھے۔ ظالم ہمیں بھگا رہے تھے۔ گاؤں سے کوئی تین میل دور ہمارے گروپ کو رکنے کا حکم ملا اور پھر ایک سیدھی قطار میں کھڑا کر کے ہمارے گروپ سے پوچھ گچھ شروع ہوئی۔ ہندوؤں کی شکایت پر پانچ مسلمان قطار میں سے گھسیٹ کر نکالے گئے اور انھیں سامنے کھڑا کر کے گولیوں سے اڑا دیا گیا میرا بھائی عبدالغفور بھی ان شہید ہونے والوں میں شامل تھا۔

اس کارروائی کے فوراً بعد ہمارے گروپ کو دوبارہ دوڑایا گیا۔ اس بار ہندو غنڈے ننگی تلواریں سونتے اور بندوقیں تھامے ہمارے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ فوج جا چکی تھی لیکن ہندو غنڈوں کو ہمارے پیچھے چھوڑ گئی تھی۔

ہم لوگ بری طرح بھاگ رہے تھے کہ راستے میں ایک جیپ آگئی۔ اس میں کوئی کرنل صاحب تھے، وہ صورتحال دیکھ کر رک گئے۔ رحمدل آدمی تھے۔ انہوں نے ہندو غنڈوں کو ڈانٹ کر بھگا دیا اور ہم سے کہا کہ آپ لوگ جہاں جانا چاہیں جاسکتے ہیں۔ آپ کو کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ لیکن ہم نے کہا کہ ہم کہاں جائیں گے؟ جہاں جائیں گے مار دیئے جائیں گے۔ چنانچہ ہمیں فوجی کیمپ ہی پہنچا دیا جائے۔ خیر ہمیں فوجی کیمپ پہنچا دیا گیا۔ وہاں پہنچے تو ایک نئی آفت آن پڑی۔ ایک سکھ صوبیدار بھاگتا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ یہ تمام مُسلے ہندوؤں کے قتل میں ملوث ہیں اس لئے انہیں گولیوں سے اڑا دیا جائے جبکہ ہمیں جس سکھ افسر کے حوالے کیا گیا تھا اس کا کہنا تھا کہ یہ لوگ سیدھے سادھے عام شہری ہیں اس لئے انہیں قتل کیوں کیا جائے؟ دونوں سکھ افسروں میں بحث و تکرار ہونے لگی اور یہ بحث و تکرار اتنی بڑھی کہ پہلے والے سکھ صوبیدار نے مارے غصے کے اپنی پیٹی اتار دی۔ ہم لوگ خوف اور ڈر کے مارے دم سادھے ایک کونے میں خاموش کھڑے دونوں سکھ افسروں کی گرما گرمی دیکھ رہے تھے جو خوب چلا چلا کر ایک دوسرے کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ ان کا شور سن کر ایک بریگیڈیئر صاحب اندر آگئے۔ انہوں نے ساری صورتحال معلوم کی اور جب اصل صورتحال ان کو پتہ چلی تو انہوں نے "ڈپلومیسی" کا مظاہرہ کرتے ہوئے سکھ صوبیدار کو سمجھایا کہ "اب ہم ان مسلمانوں کو مار نہیں سکتے کیونکہ انہیں گرفتار کر لیا گیا ہے اور رپٹ میں ان کے ناموں کا اندراج ہو گیا ہے۔ سکھ صوبیدار پھر بھی ہمیں سزا دینے پر بضد تھا۔ بریگیڈیئر صاحب کو غصہ آگیا انہوں نے چلا کر سکھ صوبیدار سے کہا۔ "اوئے جب انھیں مارنا ہی تھا تو انہیں گرفتار کیوں کیا تھا؟ وہیں مار دیتے۔"

بریگیڈیئر صاحب کا غصہ دیکھ کر سکھ صوبیدار رفوچکر ہو گیا اور ہم لوگوں کی جان میں جان آئی۔ پھر ہمیں عثمان آباد میں واقع فوجی کیمپ لے جایا گیا۔ جہاں ہم سب سے پوچھ گچھ ہوئی پھر

فوجی لاری میں شولاپور لے گئے جہاں جہ جوری ناکہ میں رات بھر رکھنے کے بعد شولاپور کی سب جیل لایا گیا۔ چار دن اور چار راتیں گزر چکی تھیں۔ ہم لوگ تین دن سے بھوکے تھے۔ بارشوں کا زمانہ تھا۔ موسلا دھار بارشیں ہو رہی تھیں۔ بھیگتے ہوئے جیل پہنچے۔ وہاں پہلی بار بدذائقہ کھانا کھایا، جو صحیح طور پر کھایا بھی نہیں گیا۔ میری تو اس کھانے کو دیکھ کر بھوک ہی اڑ گئی۔

آٹھ بجے رات اچانک ٹرین کے ذریعے ہمیں بیل گاؤں لے جایا گیا۔ بیل گاؤں کی جیل میں جوار کی روٹی ملی۔ یوں سمجھیں کہ تقریباً ۵ دن بعد یہ ہمارا پہلا کھانا تھا۔

بیل گاؤں کی جیل میں ہم لوگ تقریباً ساڑھے چار مہینے قید رہے، بقرعید بھی وہیں گزری۔ جیل میں نماز پڑھنا اور ورزش کرنا ہمارے معمولات میں شامل تھا، لہٰذا جیل میں ہماری صحت کافی بہتر ہو گئی۔

چار مہینے بعد بیل گاؤں کی جیل سے ہمیں جالنا کی جیل لایا گیا۔ یہاں ۲۰ دن تک پوچھ گچھ ہوتی رہی پھر ایک دن اچانک ہمیں رہا کر دیا گیا اور وہ بھی اس طرح کہ ہمیں جیل کے دروازے پر لاکر چھوڑ دیا گیا اور کہا گیا کہ "جہاں جانا چاہتے ہو چلے جاؤ۔"

اپنے گھر سے ستر میل دور۔ جیب میں نہ کوئی پیسہ دھیلا نہ کچھ پاس۔ نہ کوئی جاننے والا دوست عزیز۔ بہت پریشان کہ کیا کریں؟ ایک رحمدل شخص نے چار روپے دیئے۔ اس کی مہربانی سے "پربھنی" نامی گاؤں میں پہنچے "پربھنی" کے مسلمانوں نے بڑی آؤبھگت کی، کھانا کھلایا۔ گاؤں تک پہنچنے میں مدد کی۔

میں گھر پہنچا تو گھر خالی پڑا تھا۔ پورے گھر میں ویرانی کا راج تھا۔ میں بیوی بچوں کے بارے میں سخت فکر مند تھا۔ محلے کے لوگوں نے بتایا کہ تمہارے بیوی بچے تمہاری برادری کے زمیندار حسین میاں جان کے ہاں قیام پذیر ہیں۔ بھاگم بھاگ وہاں پہنچا۔ بچے مجھ سے لپٹ گئے۔ بیوی بھی آگئی۔ مجھے دیکھ کر رونے لگی۔ کہنے لگی کہ "میں تمہاری زندگی کی دعائیں مانگتی رہتی تھی اللہ کا شکر ہے! تم آگئے۔"

برادری کے سارے لوگ میرے زندہ سلامت واپس آنے پر بے حد خوش تھے۔ کسی کو یقین نہ تھا کہ میں زندہ سلامت واپس لوٹ آؤں گا۔

بعد میں لوگوں کی زبانی پتہ چلا کہ میری گرفتاری کے بعد گاؤں کے لوگوں پر قیامت گزر گئی۔ باہر کے گاؤں سے آئے ہوئے ہندو غنڈوں نے سات سو کے قریب مسلمان شہید کر دیئے۔ لاشوں سے زمین پٹ گئی تھی۔ میرے دو چچا، وہاں کی درگاہ کی مسجد کے خطیب، تین چچازاد بھائی اور برادری کے بے

شمار افراد ہندو غنڈوں کی درندگی کی بھینٹ چڑھ گئے، جو باقی بچے وہ ہجرت کر گئے۔

۵۴۔ ۱۹۴۹ء تک بڑا صبر آزما اور کٹھن دور رہا۔ ملازمت ختم ہو گئی تھی۔ گاؤں تباہ ہو چکا تھا۔ ڈیڑھ ہزار افراد میں سے تقریباً سات سو مسلمان شہید کر دیئے گئے تھے۔ کچھ ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے تھے۔

میرے اپنے دو بھائی بھی حالات سے مایوس ہو کر پاکستان سدھار گئے تھے۔ ایک بھائی شہید ہو گیا تھا۔ دیگر عزیز و اقارب کی اکثریت بھی یا تو شہید ہو چکی تھی جو بچی تھی وہ پاکستان ہجرت کر گئی تھی۔ میری دوستی ہندوؤں کے ساتھ چونکہ بہت زیادہ تھی اور وہ میری بہت عزت کرتے تھے لہٰذا میں نے ہندوستان میں ہی ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن میں نہ تو کوئی کام کرسکتا تھا اور نہ کوئی ملازمت کیونکہ ہر جگہ ہندو مسلم تعصب نمایاں تھا۔

میں نے پیٹ بھرنے کے لئے محنت مزدوری کی، جنگل سے گھاس اور لکڑیاں کاٹ کر لاتا اور بیچتا۔ رسیاں بانٹ کر بیچیں، حتیٰ کہ ہندوؤں کی تقریبات دیوالی وغیرہ پر ان کی خوشی میں شریک ہوا باجا وغیرہ بجایا۔ لیکن ہندو اب دل سے مسلمانوں سے خوش نہ تھے۔ میں نے ان کی آنکھوں میں تعصب اور تنگ نظری کی پرچھائیں دیکھ لی تھیں۔ ایک روز جب میں اپنی مزدوری لینے ایک ہندو کے گھر گیا تو اس نے نخوت سے کہا۔

"ابھی ہمارے پاس تمہیں دینے کے لئے کچھ نہیں جاؤ بعد میں آنا۔"

میں نے کہا۔

"میں نے محنت کی ہے اس کے پیسے مانگ رہا ہوں کوئی بھیک تو نہیں لے رہا۔"

اس پر وہ ہندو بہت چراغ پا ہوا غصے سے دھاڑ کر کہنے لگا۔

"اب تو راؤ رام پٹیل ہی تجھے تیری محنت کی مزدوری دے گا۔ میں تو تجھے ایک پائی بھی نہیں دوں گا۔"

اس ہندو کی باتوں نے میرے دل میں ایک آگ سی لگا دی تھی۔ اس دن پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ ہندو قوم کبھی بھی مسلمانوں کی دوست نہیں ہو سکتی، وہ ہمیشہ سے مسلمانوں کو اپنا محکوم بنا کر رکھنا چاہتی ہے۔ اس دن پہلی بار میرا دل رویا اور میں نے دل میں مصمم ارادہ کر لیا کہ اب ہندوستان چھوڑ دوں گا۔ چنانچہ تھوڑے سے زادِ راہ اور بیوی بچوں کے ساتھ میں نے اپنے گاؤں کو خیرباد کہا اور تنگ نظر اور تعصب انگیز فضا کو چھوڑ کر پاکستان کو چل پڑا جہاں آزاد پاک زمین ہماری منتظر تھی۔

آنکھ مچولی ویڈیو میگزین

اپنے آرڈر سے مطلع کیجئے

- ذہین بچے گلوکار ارشد محمود کے ہم آواز
- رات کی تاریکی میں آگ کے گرد آدم خور قبیلے کا خوفناک رقص
- اطہر شاہ خان جیدی کا تحریر کردہ دلچسپ ڈرامہ "سیکرٹ ایجنٹ ۲/۱ ۰۰۶"
- ٹی وی کے مشہور فن کار جمشید انصاری، لطیف مُنّا، ظلِ سبحان، نگہت بٹ اور بہت سے آرٹسٹ
- پشاور سے مزے دار خاکوں کا تحفہ
- اسلام آباد، لاہور اور کراچی سے دلچسپ ترین پروگراموں کی ریکارڈنگ کے بعد

آنکھ مچولی ویڈیو میگزین

فروخت کے لیے تیار ہے

اپنے آرڈر سے فوراً مطلع کیجئے

قیمت فی کیسٹ ۱۴۰/۰۰ روپے ، مع کوریئر سروس یا ڈاک خرچ

کاروباری حضرات معلومات کے لیے علیحدہ خط لکھیں

آنکھ مچولی ویڈیو میگزین

دفتر آنکھ مچولی

۱- بی آئی بی کالونی، کراچی ۵

چیزوں کے اس ڈھیر میں سے حرف "ب" سے شروع ہونے والی اشیاء کو الگ کیجئے۔

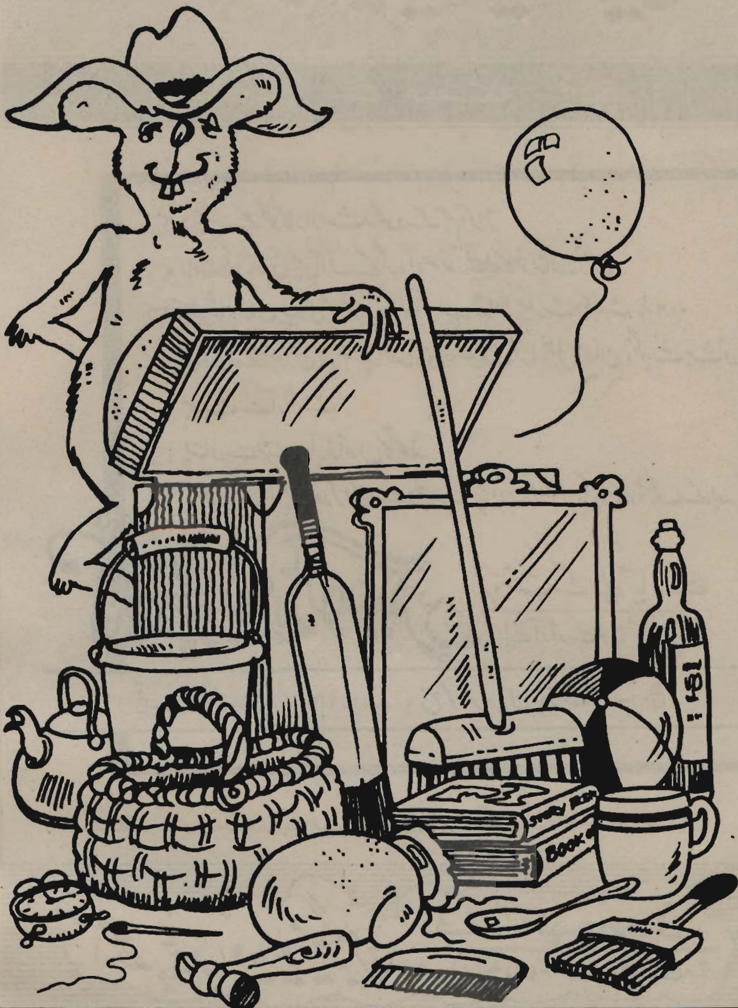

انوکھا اور جدید عجائب گھر

سیّد کاشان جعفری

انسان نے ترقی کی منزلیں تیزی سے طے کی ہیں اور وہ خلائی تحقیقات کے سفر میں جس بلندی تک پہنچ چکا ہے آج سے صرف ۸۸ سال قبل اس کا تصور بھی محال تھا جب انسان نے اپنا پہلا طیارہ فلائر اڑایا تھا...... ان تمام گزرے ہوئے سالوں کے دوران اس میدان میں جو بھی ترقی ہوئی اسے محفوظ کر کے خلائی اور سائنس سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک عظیم الشان عمارت میں محفوظ کر دیا ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں قائم عمارت اور محفوظ اشیاء کے ذخیرے کو سونیسن انسٹیٹیوٹ کے نیشنل ائیر اینڈ اسپیس میوزیم کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس میوزیم میں تاریخی اہمیت کے حامل تمام طیاروں ہوائی جہازوں اور خلائی تحقیق میں استعمال ہونے والے راکٹوں کو جمع کر کے رکھا گیا ہے۔ یہاں انسان کو پہلی پرواز سے لے کر چاند کے سفر پر جانے والے خلائی راکٹ اپنی اصل حالت یا پھر ماڈل کی صورت میں محفوظ کئے گئے ہیں۔

یہ میوزیم دنیا کا سب سے بڑا اور اپنی نوعیت کا

سب سے حیرت انگیز ترقیاتی اشیاء کا خزانہ ہے۔

اس عظیم الشان اور حیرت انگیز میوزیم کا ابتدائی خاکہ ۱۹۷۶ء میں بنایا گیا اور اور پھر ۵۰ کروڑو کے کثیر سرمائے سے اس کی تکمیل عمل میں آئی۔

یکم جولائی ۱۹۷۶ء کو سابق امریکی صدر جیرالڈ فورڈ نے جب ہزاروں ناظرین اور شائقین کی موجودگی میں خلائی سفر پر جانے والے راکٹ وائیکنگ کا افتتاح کیا اور اس خلائی راکٹ نے ۳۲ کروڑ کلو میٹر کے فاصلے سے ایک ریڈیائی سگنل کی مدد سے افتتاحی فیتے کو کاٹا تو لوگوں کے لئے یہ ایک بڑا ہی حیرت انگیز مظاہرہ تھا۔

اس حیرت ناک میوزیم میں ہر روز ۵۰ ہزار شائقین آتے ہیں اور یہاں کی معلومات سے محظوظ ہوتے ہیں۔ اس میوزیم کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ عمارت کے خصوصی داخلے والے گیٹ پر داخل ہوتے ہی رائٹ برادران کا بنایا ہوا پہلا طیارہ فلائر اپنی اصل حالت میں چھت سے لٹکا ہوا نظر آئے گا۔ اس طیارے کو اسی بلندی پر یعنی زمین سے ۳۶۷ میٹر کی اونچائی پر لٹکا کر رکھا گیا ہے۔ جس بلندی تک اورول رائٹ ۱۶ دسمبر ۱۹۰۳ء کو اس طیارے کو اڑا سکے تھے۔

فلائر طیارے کے بالکل ہی عقب میں اپولو ۱۱ کا خلائی راکٹ کولمبیا رکھا ہوا ہے۔ جس میں سوار ہو کر نیل آرمسٹرام اور ایڈون آلڈرین نے چاند کی سیر کی تھی اور چاند کی زمین پر قدم رکھنے والے پہلے انسان ہونے کا اعزاز حاصل کیا تھا۔

اس کے اوپر اسپرٹ آف سینٹ لوئیس نامی طیارہ رکھا گیا ہے۔ اس طیارے کی تاریخی اہمیت یہ ہے کہ ۱۹۱۷ء میں چارلس آگسٹ لنڈ برگ نے نیو یارک سے پیرس تک بحر اٹلانٹک عبور کرتے ہوئے کامیاب پرواز کی تھی۔ مسٹر لنڈ برگ سے پہلے حالانکہ بحر اٹلانٹک پر کامیاب پرواز کی جاچکی تھی مگر انہیں امریکہ اور یورپ کے درمیان اہم تعلقات قائم کرنے والے پہلے فرد ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس طیارے پر کئی ممالک کے جھنڈوں کے نشان بنے ہوئے ہیں۔ یہ پرچم ان ممالک کے ہیں جہاں، جہاں لنڈ برگ خیر سگالی دورے پر گئے۔ اس طیارے کے ڈیش بورڈ پر لنڈ برگ نے پیرس کے سفر کے دوران طیارے میں خرچ ہونے والے ایندھن کا حساب پینسل سے لکھا تھا۔ اسے بھی اسی طرح محفوظ کر لیا گیا ہے۔

سب سے پہلے لیکویڈ (مائع) گیس استعمال کرنے والے راکٹ انجن کو بھی آپ یہاں موجود پائیں گے اس عظیم الشان میوزیم کے فرش پر جون گلین کا فرینڈ شپ اور رابرٹ ایف گوڈارڈ کا تجربے کے طور پر ایجاد ہونے والا بیڈول اور نہایت کمزور راکٹ انجن بھی رکھا گیا ہے۔ ان راکٹ انجنوں میں پہلی بار گیس ایندھن کا استعمال ہوا۔ حالانکہ یہ صرف ۱۲۵ میٹر کی بلندی تک ہی اڑ سکے تھے۔ یہ تجربہ ۱۹۲۶ء میں کیا گیا تھا۔ ان انجنوں کو

بعد میں ایجاد ہونے والے انجنوں کی ایجاد کے بعد ہی موجودہ دور کے طاقتور ترین انجنوں کا پیش رو یا بابا آدم کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ان انجنوں کی ایجاد کے بعد ہی موجودہ دور کے طاقتور ترین انجنوں کی ایجاد ممکن ہو سکی ہے۔ موجودہ دور کے تمام تر جدید راکٹ انجنوں میں گیس ایندھن ہی استعمال ہوتا ہے۔

پیڈل سے اسٹارٹ ہونے والا بہت ہی کم وزن کا ہلکا پھلکا صرف ۳۲ کلو گرام کا کوسامور کینڈور کو بھی یہاں محفوظ کر کے چھت سے لٹکا دیا گیا ہے۔ لیرپناڈی۔ سی ۲ جو ۱۱۶۵ ٹن وزنی ہے کو چھت پر لٹکوانے کے لئے خصوصی طور پر قینچیاں بنوائی گئی ہیں۔

میوزیم کے تینوں حصوں جو الگ الگ بڑے ہال کی صورت میں ہیں کی چھتیں فولادی شیشے سے تعمیر کی گئی ہیں۔ تاکہ شائقین فضائی ماحول اور خلائی لطف سے بھی محفوظ ہو سکیں۔ ۱۹۳۴ء کی طیارہ ریس میں دوسری پوزیشن حاصل کرنے والا بوئنگ ۲۴۷ بھی یہاں رکھا گیا ہے۔ ۱۹۹۲۰ء اڑائے گئے ہوائی جہاز (کھلے کاک پٹ) والے بھی یہاں محفوظ ہیں۔ جس کی وجہ سے لنڈبرگ جیسے باصحت ہوا باز تاریخ کو ملے۔

اس وسیع و عریض میوزیم کی عمارت کے بالکل مخالف سمت میں خلاء اور اسکائی لیب اور شٹل ورک شاپ ہے۔ جہاں شمسی توانائی سے چلنے والے آلات کے ماڈلز رکھے گئے ہیں۔ ۱۹۷۵ء روس اور امریکہ کی خلائی تجربات میں کام آنے والے راکٹ اپولو اور سویوز بھی رکھے گئے ہیں جنہوں نے خلاء میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر (منسلک ہو کر) ایسٹرو ناٹ اور کاسمو ناٹ کے درمیان تعاون کیا تھا۔

ان ماڈلز طیاروں کے علاوہ میوزیم میں عکسی تصویروں (کیمرہ فوٹوز) اور فلموں کے ذریعے خلاء میں تیرنے والے تاروں اور سیاروں کی نمائش بھی کی جاتی ہے۔ البرٹ آئن اسٹائن سارہ گروپ میں بڑی بڑی طاقتور دور بینوں کے ذریعے ستاروں کو دیکھا بھی جاسکتا ہے۔ اس رسد گاہ نے ہیلی نامی دم دار ستارے کی تاریخ اور اس کی واپسی کا بھی پتہ لگایا ہے۔

یہاں فضا اور خلاء سے متعلق نئی نئی معلومات مہیا کی گئی ہیں۔ سلور ہل میری لینڈ پولائی گاربر فیسلٹی سے یہاں مختلف ٹکڑوں میں لائے گئے مختلف جہازوں کو یہاں جوڑ کر رکھا گیا ہے اسی قسم کا ایک جہاز گرو مین ایلبیٹروس کائٹر تھا جو پہلی جنگ عظیم میں استعمال کیا گیا۔ وہ بھی اسی میوزیم میں موجود ہے۔ یہ اسمتھ سونین کے پاس اتنے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں آیا تھا کہ کئی ٹکڑے تھیلوں اور بالٹیوں میں رکھے گئے تھے۔ جب ان تمام ٹکڑوں کو پھر سے جوڑا گیا تو اب یہ بالکل نیا طیارہ محسوس ہوتا ہے۔

میوزیم کے روح رواں مسٹر ڈون لو پیج جنہوں نے دوسری جنگ عظیم میں کافی کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے۔ میوزیم کے مستقبل کے سلسلے میں بڑی اچھی توقعات اور امیدیں رکھتے ہیں۔ ان کی اسکیم ہے کہ وہ شائقین اور ناظرین کو بڑے بڑے جیٹ طیاروں کی تکنیک اور اس کی مشینری سے بھی روشناس کرائیں۔ ان کی یہ بھی خواہش ہے کہ اس میوزیم کے تحت ایسے بڑے طیاروں کے پرواز کرنے اور زمین پر اترنے کے عملی مظاہرے بھی کرائیں۔ ابھی یہ سب ذہنی طور پر ایک تصور اور خاکہ ہے۔ دیکھئے اسے عملی جامہ پہنانے میں کب تک کامیابی ہوتی ہے۔

میوزیم میں ایک بڑے سینما گھر کا اہتمام بھی کیا گیا ہے۔ جہاں ایمکسی عمل کے ذریعے ۷۰ ایم۔ ایم کی فلمیں نمائش کے لئے پیش کی جاتی ہیں۔ اس ہال کا اسکرین ۱۷/ ۱۸ میٹر ہے۔

میوزیم کا سب سے جدید ائٹم وائزر ہے جس نے دوبارہ ایندھن لئے بغیر زمین کے گرد ۴۱۰۰۰ کلو میٹر کا سفر نو دن میں طے کیا۔ میوزیم میں زمین اور سیاروں سے متعلق بھی ایک مرکز ہے۔ جہاں چاند کے جغرافیائی سیاروں سے حاصل ہونے والی معلومات پر تحقیق ہوتی ہے۔

میوزیم کے ڈائریکٹر والٹر جے بوئین کے مطابق اس میوزیم کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ میوزیم کے ابتدائی سال میں اسے دیکھنے کے لئے آنے والے شائقین کی تعداد تیس لاکھ تھی۔ جو اب بڑھ کر پچاس لاکھ سالانہ تک پہنچ گئی ہے۔ میوزیم میں پچاس ہزار فلمیں، ویڈیو اور ڈسکوں پر محفوظ ہیں۔

ایک سو پچاس سال قبل قائم ہونے والا سونتھن انسٹیٹیوٹ کے میوزیم کا یہ حصہ دوسرا سب سے بڑا اور اہم حصہ ہے۔ جو تعلیمی میدان میں بڑی اہم خدمات انجام دے رہا ہے۔ میوزیم میں کیو۔ این سری سرپ (ڈائنوسار) جس کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی حیثیت میں اڑنے والا جاندار بھی تھا کا ماڈل بھی رکھا ہے جسے پال میکر گریڈی ٹیم نے بنایا ہے لیکن اسے اڑایا نہیں جسکا اور یہ حادثے کا شکار ہو گیا حادثے کا شکار ہونے سے قبل اس کی فلم بنائی گئی تھی جو یہاں یعنی میوزیم میں محفوظ کرلی گئی ہے۔ یہ مشینی پرواز اور انسانی پرواز کے درمیان کی ایک اہم کڑی ہے۔

نارتھوپ نے ۱۹۳۰ء میں اڑنے والے پنکھوں کو ایجاد کیا تھا اور طیارہ سازی کے سلسلے میں انقلابی تجربات کئے تھے۔ اس میوزیم نے اس سلسلے میں چالیس کتابیں بھی شائع کی ہیں اس کے علاوہ میوزیم میں فضا اور خلاء سے متعلق تمام اشیاء کو محفوظ کر کے رکھا گیا ہے تاکہ یہ آئندہ تحقیق کرنے والوں کے کام آسکے۔ دنیا میں یہ میوزیم اپنی نوعیت کا عظیم ترین اور حیرت انگیز میوزیم ہے۔

ہمارا عزم

عبدالقادر

اپنے وطن کی شان بڑھاتے رہیں گے ہم
گلشن میں اپنے پھول کھلاتے رہیں گے ہم

سائے نہ رنج و غم کے یہاں آئیں گے کبھی
نغمے خوشی کے سب کو سناتے رہیں گے ہم

کرتے رہیں گے علم کی مشعل سے روشنی
تاریکیوں کو دور بھگاتے رہیں گے ہم

چلنا ہے سیدھی راہ پہ دینِ مبین کی
بھٹکے ہوؤں کو راہ دکھاتے رہیں گے ہم

دل جیت لیں گے سب کا محبت سے پیار سے
سینے سے دشمنوں کو لگاتے رہیں گے ہم

روشن رکھیں گے ہم سدا امید کا چراغ
مایوسیوں سے دل کو بچاتے رہیں گے ہم

ہمت جو ہار بیٹھے ہیں ان کو ابھار کر
پھر عزمِ نو سے راہ پہ لاتے رہیں گے ہم

خوشبو چمن میں ہوگی محبت کی، پیار کی
نفرت کو اپنے دل سے مٹاتے رہیں گے ہم

اب نفرت و عناد سے کیا ہم کو واسطہ؟
غنچے محبتوں کے کھلاتے رہیں گے ہم

نظریں کوئی اٹھانے کی ہمت نہ کر سکے
قوت وطن کی خوب بڑھاتے رہیں گے ہم

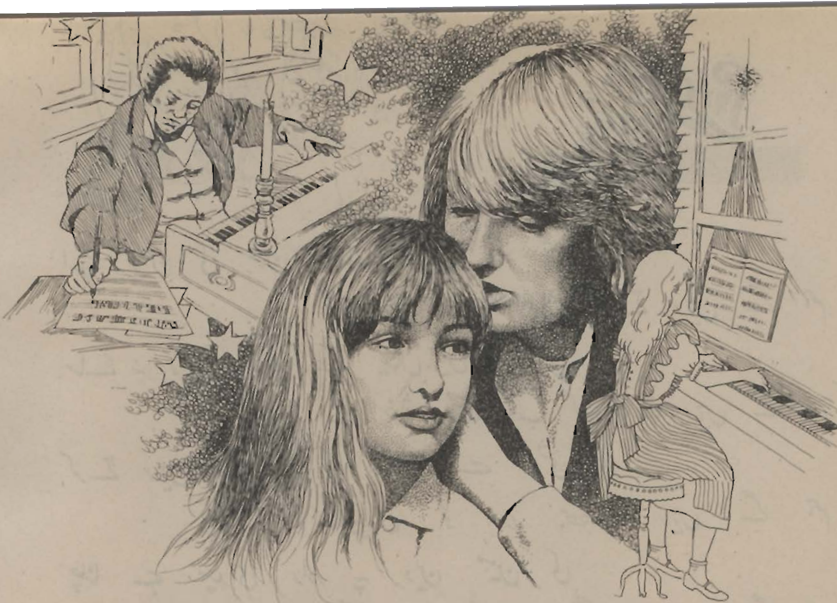

آخری شاہکار

تحریر: ہیلن گریسولڈ　　ترجمہ: کاشف شہزاد

جب میں کہتی ہوں کہ ماریا میرے لئے بہت خاص تھی تو مجھے امید ہے کہ آپ مسکرا دیں۔ تمام ماؤں کے لئے ان کے بچے خاص ہوا کرتے ہیں۔ ماریا میری واحد اولاد تھی۔ شاید آپ یہ سوچنے لگ جائیں کہ 'اکلوتے پن کی وجہ سے ایسا ہو، مگر جب میں آپ کو یہ بتاؤں گی کہ جب ماریا کی عمر صرف آٹھ ماہ تھی تو میرے شوہر پیٹر کا جو کہ وائلن نواز تھے، انتقال ہو گیا تو شاید آپ کو ماریا سے میرے لگاؤ پر تعجب ہو لیکن حقیقت یہی کچھ ہے۔

ماریا عجیب و غریب خصوصیات کی حامل تھی ناقابل یقین حد تک عجیب و غریب۔ جب ماریا پیدا ہوئی تو ہمارے لئے اتنی ہی خاص تھی جتنا کہ کوئی نوزائیدہ بچہ پیار کرنے والے والدین کے لئے خاص ہو سکتا ہے۔ ہمارے لئے ماریا کی پیدائش اس لئے بھی خاص تھی کہ پیٹر کی زندگی کے، جو کہ پھیپھڑوں کے سرطان کا مریض تھا، صرف چند ماہ باقی تھے اور ہمارے پاس اولاد کی خوشیاں دیکھنے کے لئے بہت قلیل عرصہ تھا۔ پیٹر

ماریا سے اپنی زندگی کے آخری چند مہینوں میں بے حد قریب رہا۔ وہ گھنٹوں ماریا کے پاس بیٹھا رہتا اور اس کے پُرسکون چہرے کو دیکھتا رہتا جیسے اسے ہمیشہ کے لئے اپنے دل پر نقش کرلینا چاہتا ہو۔

پیٹر ماریا کو اپنی بنائی ہوئی دھنیں سنایا کرتا، خود نہیں بلکہ ریکارڈز پر۔ وائلن بجانا تو اس نے ماریا کی پیدائش سے چند ماہ پہلے ہی چھوڑ دیا تھا۔

میں کبھی کبھی ہنس دیا کرتی اور کہا کرتی کہ ابھی اس کی عمر نرسری کی نظمیں سننے کی ہے یا تمہارے ان ریکارڈز کو سننے کی، لیکن وہ بڑی سنجیدگی سے کہا کرتا تھا کہ یہ ضرور ہے کہ ماریا ابھی بول نہیں سکتی لیکن وہ سن سکتی ہے، وہ ہمیشہ سنتی رہتی ہے، اسے دیکھ کر لگتا ہے جیسے وہ اس دنیا کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو جس میں وہ ابھی ابھی داخل ہوئی ہے ، وہ جو کچھ سنتی ہے' وہ اگر دلکش اور خوبصورت ہے تو اپنی ساری زندگی خوبصورتی اور دلکشی کی تلاش میں رہے گی۔ آج مجھے یقین ہے کہ پیٹر درست کہتا تھا۔

ماریا کی ابتدائی زندگی بالکل عام بچوں کی طرح بسر ہوئی۔ نئے نویلے والدین کی طرح ہم اس کے ساتھ کھیلا کرتے۔ اسے ہنسانے کی کوششیں کیا کرتے مگر وہ اس وقت زیادہ مسرور دکھائی دیتی تھی جب وہ کوئی گیت سن رہی ہو۔

ماریا کے بچپن کی ساری باتیں مجھے اچھی طرح یاد نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک عورت کے لئے اپنے بچے کی نشوونما کے دن اور شوہر کی زندگی کے آخری دن دیکھنا (ایک ہی وقت میں) بڑا کربناک ہوتا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ پیٹر نے مجھے کبھی بھی غم زدہ ہونے کی اجازت نہیں دی اور نہ کبھی یہ احساس ہونے دیا کہ وہ بہت جلد ہم سے بچھڑ جائے گا۔

پیٹر اکثر کہا کرتا تھا" ماریا پر کبھی بھی غم کا سایہ نہیں پڑنے دینا' اسے غم کے سانچے کی بجائے موسیقی کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرنا۔

ایک بہت ہی عجیب بات ماریا کے ساتھ یہ تھی کہ وہ کہا کرتی تھی، "مجھے ابو کی شکل یاد ہے، وہ ہمیشہ مسکراتے رہتے تھے۔" اگرچہ ایک بچی کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ ایک ایسے چہرے کو یاد رکھ سکے جس کو اس نے بمشکل سات یا آٹھ ماہ دیکھا ہو۔

جب پیٹر کا انتقال ہوا تو ماریا دن بدن کمزور ہوتی چلی گئی۔ اس کا خوبصورت چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بھی پیٹر کا سوگ منا رہی ہو۔ پیٹر کی موت کے بعد گھر میں شدید خاموشی طاری رہی۔ پیٹر کی غیر موجودگی کا احساس بڑا شدید تھا اس احساس کی شدت کم کرنے کے لئے میں نے پیٹر کے ریکارڈز کا سہارا لیا۔ جلد ہی میں خوبصورت موسیقی میں ڈوب گئی۔ اس خوبصورت موسیقی کی آواز کے ساتھ میں نے ایک اور آواز سنی...... ماریا کی آواز۔

میں جلدی سے اگلے کمرے میں گئی، جہاں وہ اپنے کارٹ میں لیٹی انتہائی سنجیدگی سے گنگنا رہی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ دوسرے بچوں کی طرح عام سی بے ربط آوازیں ہی نکال رہی ہو لیکن میرے لئے وہ آوازیں بھی کسی خوبصورت گیت سے کم نہیں تھی۔ میں اسے اٹھا کر اپنے کمرے میں لے آئی اور پھر ہم دونوں دیر تک پیڑ کی بنائی ہوئی دُھنیں سنتے رہے۔

کچھ بچے پہلے چلنا سیکھتے ہیں، کچھ بولنا، ماریا نے پہلے گایا۔ موسیقی اس کی رگ رگ میں بھری ہوئی تھی۔ جب وہ کچھ بڑی ہوئی تو لوگوں نے اس کی آواز کی گہرائی اور پختگی کی تعریف کی۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ موسیقی کے بارے میں وہ بالکل اپنے باپ پر گئی ہے۔ یہ اگرچہ بالکل سچ تھا لیکن یہ صرف میں ہی جانتی تھی کہ وہ گانے کے ساتھ موسیقی بھی ترتیب دے رہی ہے۔ تین سال کی عمر میں وہ وائلن اور پیانو بجانا سیکھ گئی تھی۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ دنیا جلد ہی اسے دریافت کر لے گی اور وہ مجھ سے اسے چھین لیں گے۔ یہ خوف میرے دل میں بہت مضبوطی سے بیٹھ گیا تھا۔

جب ماریا چار سال کی ہوئی تو اس کی تصویریں اخباروں کی شہ سُرخیاں بننے لگیں۔ جب وہ پانچ سال کی ہوئی تو موسیقی کے مشہور اساتذہ اور پروفیسر ہمارے گھر آنے لگے، وہ چاہتے تھے کہ میں ماریا کو کسی موسیقی کے اسکول میں داخل کرا دوں تاکہ اس کی صلاحیتوں کو نشوونما مل سکے لیکن میں ماریا سے جدائی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ بالآخر میں نے اپنے اندر کی خود غرضی پر قابو پالیا اور ماریا کو موسیقی کے اسکول بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔

جب ماریا کو میرے فیصلے کے بارے میں معلوم ہوا تو وہ بہت خوش ہوئی، جس سے میرے جذبات کو ٹھیس پہنچی۔ شاید اس نے بھی یہ بات محسوس کی ہو۔

"میں چھٹیوں میں گھر آیا کروں گی، بیوقوف اماں" (وہ مجھے چھیڑنے کے لئے بیوقوف اماں ہی کہا کرتی تھی) "اداس مت ہوئیے ورنہ میرا سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔" اس نے اصرار کیا۔

سو، میں نے اس کی خوشی کی خاطر خوش نظر آنے کی کوشش کی۔ اس کے جانے سے چند ماہ قبل میں نے اس کی بنائی ہوئی تمام دُھنیں اور گیت جمع کر لئے تاکہ اس کی غیر موجودگی میں ان سے دل بہلا سکوں۔

جب وہ اسکول گئی تو وہ سات سال کی تھی۔ "ہم ایک دوسرے کو خط لکھیں گے۔" اس نے کہا "مجھے اپنے ٹیپ ضرور بھیجنا اور کوشش کرنا کہ تمہارا تیار کردہ کوئی گیت ضائع نہ ہونے پائے۔" اس نے وعدہ کیا کہ وہ ایسا ہی کرے گی۔

اس کی جدائی بہت تکلیف دہ تھی۔ اس کی یاد آتے ہی میری آنکھیں بھیگ جاتی تھیں

وقت گزاری کے لئے کچھ دنوں بعد میں نے ایک ادارے میں ملازمت کرلی۔ پہلے تین مہینے اس کے بغیر کس طرح گزرے، یہ میں ہی جانتی ہوں۔

دسمبر کی پندرہ تاریخ کو وہ چھٹیوں میں گھر آگئی۔ ایک آدھ روز اس کا رویہ کچھ اجنبی سا لگا پھر ہم یوں گھل مل گئے جیسے وہ کبھی کہیں گئی ہی نہ ہو۔ ایک شام ہم دونوں طربیہ نغموں کا ایک پروگرام دیکھ رہے تھے جو کرسمس کے موقع پر، بچوں نے مقابلے میں بھیجے تھے جب نغموں کا یہ مقابلہ ختم ہوگیا تو ماریا کہنے لگی "اگلے سال، بیوقوف اماں، میں بھی ایک طربیہ نغمہ بناؤں گی۔"

کرسمس اور نئے سال کی تقریبات آئیں اور گزر گئیں۔ اس دفعہ جب وہ اسکول گئی تو غم کا احساس اتنا شدید نہیں تھا۔ (ہم بہت جلد مختلف چیزوں کے ساتھ مطابقت پیدا کرلیتے ہیں حتیٰ کہ ان کی غیر حاضری سے بھی جن کو ہم چاہتے ہیں) ہر ہفتے ماریا کا خط آتا تھا، ہجّوں کی غلطیوں سے بھرا ہوا، اس کے خطوں میں ان تمام کاموں کی تفصیل ہوتی تھی جو وہ کر رہی ہوتی تھی اور بالخصوص اس موسیقی کے بارے میں جو وہ ترتیب دے رہی ہوتی تھی۔

ماریا کی اگلی گرمیوں کی چھٹیاں ہم دونوں نے ایک جھیل کے کنارے گزار دیں۔ میں نے ماریا سے کبھی اس کے مستقبل کے بارے میں نہیں پوچھا۔ نامعلوم کیوں؟ شاید اس لئے کہ میرے خیال میں وہ پہلے ہی وہ سب کچھ بن چکی تھی جو اسے بننا تھا۔ وہ ہمہ وقت کچھ بننے کے عمل سے گزر رہی تھی اور وہ یہ بخوبی جانتی تھی۔

جب وہ دوبارہ اسکول کے لئے روانہ ہوئی تو اس کی جدائی قدرے کم محسوس ہوئی۔ میں نے شام میں فرنچ زبان کے کورس میں رجسٹریشن کرالی اور کبھی کبھار دوستوں کے ساتھ شام کے کھانے پر یا تھیٹر بھی جانے لگی۔ ماریا کے ریکارڈز میں اب بھی سنا کرتی تھی اور وہ برابر مجھے اپنے نئے ریکارڈز بھیجتی رہتی تھی۔

ایک دفعہ نومبر میں ماریا نے مجھے فون کیا تو بتایا کہ اس نے طربیہ نغمہ تیار کرلیا ہے اور وہ اس سال کے مقابلے میں اپنا نغمہ بھیجے گی۔ یہ سن کر مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میری چیخ نکل گئی۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ اپنے کلاس فیلو کے ساتھ گھر آرہی ہے تاکہ نغمہ پیانو پر ریکارڈ کر سکے۔

ماریا کا فون منگل کے روز آیا تھا اور اس کو جمعے کی شام کو آنا تھا۔ اس طرح اس کے استقبال کے لئے میرے پاس تین دن تھے۔ ان تین دنوں میں، میں نے ماریا کے لئے شاپنگ کی اور اس کی پسندیدہ ڈشیں تیار کیں۔ جمعے کی شام کو ساڑھے پانچ بجے میں چکن روسٹ بنا رہی تھی کہ مجھے خیال آیا کہ گھر میں اورنج جوس نہیں ہے جو کہ اس کا پسندیدہ مشروب تھا۔

پونے چھ بجے میں نے دروازے پر ایک نوٹ لکھ کر لگایا "میں پانچ منٹ میں آرہی ہوں۔"
اور گاڑی نکال کر سپر مارکیٹ کے لئے روانہ ہوگئی۔ مجھے بالکل خیال ہی نہیں رہا کہ جمعے کو شہر کی سڑکوں پر کتنا رش ہوتا ہے۔ بڑی مشکلوں سے آدھے گھنٹے میں اورنج جوس لے کر گھر پہنچی تو ہماری پارکنگ لاٹ میں ایک پولیس کار کھڑی تھی۔ میں گاڑی سے اتر کر جلدی سے دروازے کی طرف بڑھی، جہاں دو پولیس والے کھڑے تھے۔ میں پوری کوشش کر رہی تھی کہ اپنے اعصاب قابو میں رکھوں لیکن میری ٹانگوں پر کپکپاہٹ طاری تھی۔ ان میں سے ایک پولیس والے نے مجھ سے دریافت کیا۔ "مسز پیٹر آپ ہیں؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ کہنے لگا۔ "آپ کے لئے ایک خبر ہے" وہ مزید کچھ کہنے کی جسارت کر رہا تھا مگر الفاظ اس کے ہونٹوں پر نہیں آرہے تھے بالآخر انہوں نے مجھے بتایا کہ ماریا اپنے کلاس فیلو کے ساتھ کار کے حادثے میں جاں بحق ہوگئی تھی۔ اس کے بعد مجھے کچھ نہیں معلوم کہ کیا ہوا؟ صرف اتنا یاد ہے کہ اس پولیس والے نے مجھے ماریا کی وہ کیسٹ پہنچا دی جس میں اس نے اپنا نغمہ ریکارڈ کیا تھا۔

ماریا کے جنازے کے کافی دنوں بعد تک میں بالکل ٹوٹی پھوٹی سی رہی۔ مجھے ارد گرد کی دنیا کا ہوش نہیں رہا تھا۔ اچانک ایک روز مجھے ماریا کی اس کیسٹ کا خیال آیا میں نے ہچکچاتے ہوئے وہ کیسٹ ٹیپ ریکارڈ میں لگائی اور "پلے" کا سوئچ دبا دیا۔

کمرے میں دوسرے ہی لمحے ایک خوبصورت آواز ابھری۔ بلبل جیسی خوبصورت اور شیریں آواز، ماریا کی آواز۔

...... پہلے بہت پہلے سے آج
...... کو رات آدھی کہیں دور "

جب تک میں نغمہ سنتی رہی میرے سارے وجود پر کپکپی سی طاری رہی اور میری آنکھوں سے سیلاب جاری رہا۔ بالآخر نغمہ ختم ہوا، میں نے کیسٹ نکال کر الٹ پلٹ کر دیکھی تو اس پر ایک ٹیگ لگا ہوا دکھائی دیا۔ "بیوقوف اماں کے لئے حقیر سا تحفہ۔"

اس کا یہ تحفہ اگرچہ میرے لئے آخری تحفہ تھا مگر یہی تحفہ میری نظر میں دنیا کے تمام تحائف سے قیمتی تھا۔

میں نے وہ نغمہ مقابلے میں بھیج دیا۔ حسب سابق ماریا کے نغمے نے ہی پہلا انعام جیتا۔ پروگرام کے کمپیئر نے کہا "مجھے بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ننھی ماریا اس مقابلے کے لئے نغمہ ریکارڈ کرنے کے بعد آٹھ سال کی عمر میں کار کے حادثے میں ناگہانی طور پر ہلاک ہوگئی۔ موسیقی کی دنیا میں اگرچہ ماریا کا نام نیا نہیں لیکن اس کا یہ نغمہ بلاشبہ ایک شاہکار ہے۔ ماریا کا آخری شاہکار۔

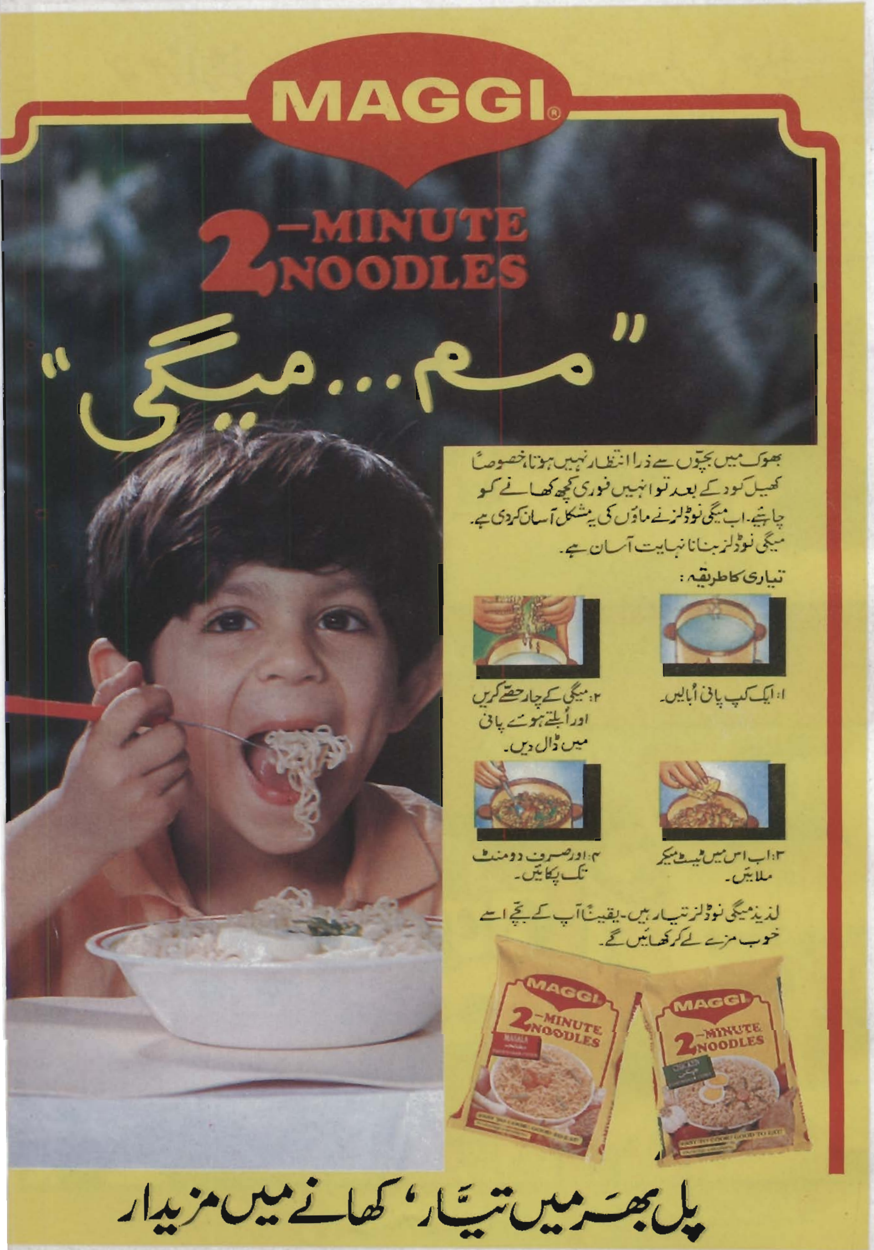
MAGGI®
2-MINUTE NOODLES
"مم... میگی"
بھوک میں بچّوں سے ذرا انتظار نہیں ہوتا،خصوصاً
کھیل کود کے بعد تو انہیں فوری کچھ کھانے کو
چاہیئے۔ اب میگی نوڈلز نے ماؤں کی یہ مشکل آسان کردی ہے۔
میگی نوڈلز بنانا نہایت آسان ہے۔
تیاری کا طریقہ:
۱: ایک کپ پانی اُبالیں۔
۲: میگی کے چار حصّے کریں اور اُبلتے ہوئے پانی میں ڈال دیں۔
۳: اب اس میں ٹیسٹ میکر ملائیں۔
۴: اور صرف دو منٹ تک پکائیں۔
لذیذ میگی نوڈلز تیار ہیں۔ یقیناً آپ کے بچّے اسے خوب مزے لے کر کھائیں گے۔
MAGGI
2-MINUTE NOODLES
MAGGI
2-MINUTE NOODLES
پل بھر میں تیّار، کھانے میں مزیدار

جو ہزاروں دیپ بُجھے تو یہ چراغ جلا

مقابلہ تصویرِ آزادی کی انعام یافتہ تصویریں

پہلا انعام

کاشف اشفاق ـــ راولپنڈی

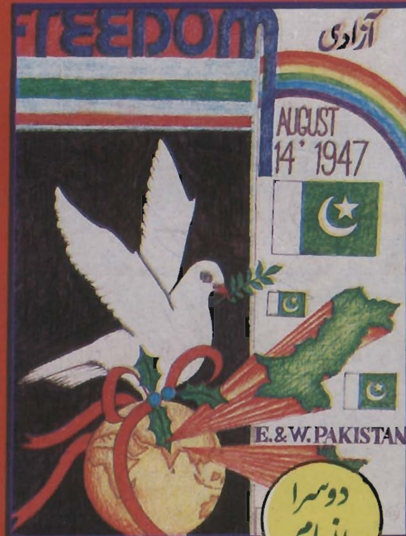

دوسرا انعام

زاہد منان قریشی ـــ آزاد کشمیر

تیسرے دو انعام

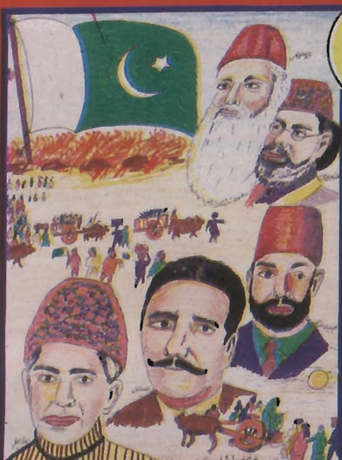

محمد ظفراللہ ضیاء ـــ کمالیہ

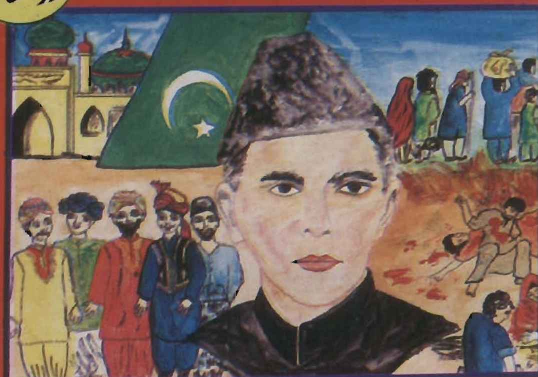

لبنیٰ ارشاد قریشی ـــ ہری پور ہزارہ

مقابلۂ تصویرِ آزادی کس نے جیتا؟

آزادی نعمت ہے۔ جو قومیں اپنی تاریخ کو یاد رکھتی ہیں وہ آزادی کی قدر کرنا جانتی ہیں۔ ہمارا ملک پاکستان بڑی قربانیوں کے بعد بنا ہے۔ ہمارے آباو اجداد نے اس کے لئے جان و مال، عزت و آبرو اور زمین کی قربانیاں دی ہیں۔ ہمیں اپنے بزرگوں کی قربانیوں کا احساس ہے اور اس احساس کو مقابلہ تصویرِ آزادی میں ساتھیوں نے قربانی کے انمول رنگوں سے سجا کر آزادی کی اہمیت کی پہچان کرائی ہے۔

سینکڑوں تصاویر میں سے تین بہتر تصاویر کے انتخاب کا مرحلہ بھی بڑا سخت تھا۔ اس سلسلے میں شہر کے معروف مصوروں سے مدد لی گئی اور ان کے رائے کے مطابق مندرجہ ذیل ساتھیوں کی کاوش کو بہتر قرار دیا گیا۔ ہم انعام جیتنے والے ساتھیوں کو مبارک باد دیتے ہیں اور اپنے سب ساتھیوں کے جذبۂ حریت کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔

اول انعام ...... کاشف اشفاق، راولپنڈی۔

دوئم انعام ...... زاہد منان قریشی، آزاد کشمیر۔

سوئم انعام ...... محمد ظفر اللہ ضیاء، کمالیہ .... لبنیٰ ارشاد قریشی، ہری پور ہزار۔

چند ساتھیوں کے نام جنھوں نے پیاری پیاری تصویریں بنا کر بھیجیں۔

اصغر شہزاد، لاہور۔ علی احمد جان، بلتستان۔ محمد عمران سعید، کراچی۔ رابعہ ابراہیم، ملیر کینٹ، کراچی۔ ثقلین حسن شہریار، جھنگ۔ شائستہ جمیل، نارتھ کراچی۔ عزیز احمد رونجی، لسبیلہ۔ لبنیٰ سیدہ کاشفہ خاتون نقوی، نارتھ کراچی۔ حنا انور، کراچی۔ سید نیر آفاق سبزواری۔ یاسمین رحمت، ساہیوال۔ فہمینہ برڑو، ٹھٹھہ۔ صائمہ کنول، عظمیٰ کنول، حیدر آباد۔ ثاقب فاروقی، دھنوٹ۔ محمد رفیق دانش، حیدر آباد۔ ولید خالد، لاہور۔ اورنگ زیب، آزاد کشمیر۔ ایس ایم تمیم، کراچی۔ اسد علی خان، لطیف آباد حیدر آباد۔ عالیہ صدف، سرگودھا۔ ندیم احمد قائم خانی، سکھر سندھ۔ عاصمہ صلاح الدین، لاہور۔ عمارہ شاہد، لاہور۔ سمیہ اکرم، سرحد۔ وقاص بن حسن، بہاولپور۔ عافیہ سعید، چکوال۔ رفاقت اللہ یوسف زئی، ڈیرہ اسماعیل خان۔ محمد اشفاق مغل، لاہور۔ محمد علی انصاری، کراچی۔ ریاض احمد، کراچی۔ لبنیٰ سلام، واہ کینٹ۔ حسرت آرٹس، کراچی۔ عشرت اقبال۔ صدر، کراچی۔

لال پری

سلمان غزالی

اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ہینڈل پر دباؤ ڈالا۔ دروازہ بڑی آہستگی کے ساتھ کھل گیا۔ اندر قد آدم آئینے کے سامنے ایک باوقار عورت کھڑی اپنی ساڑھی کا پلو درست کر رہی تھی۔ اس نے دروازہ پورا نہیں کھولا بلکہ تھوڑی سی جگہ سے ہی گزر کر کمرے میں داخل ہوگئی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور اس کے خوبصورت فراک پر جگہ جگہ سیاہی کے دھبے پڑے تھے۔ اس کے دونوں ہاتھ بھی سیاہی سے لتھڑے ہوئے تھے لیکن اس نے بڑی احتیاط اور مضبوطی سے قلم اور زرد رنگ کا کاغذ تھاما ہوا تھا۔ اس کی عمر سات آٹھ برس رہی ہوگی۔ اس کے چہرے پر بہت بھولاپن تھا اور تاثرات بچکانہ تھے، جس سے وہ بہت چھوٹی معلوم ہوتی تھی۔ آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی عورت اس کی والدہ تھیں۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنی تیاری کا جائزہ لے رہی تھیں۔ جب انہیں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو انہوں نے مڑ کر دیکھا بچی مشکل سے ان سے دو گز کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں رہ رہ کر چمک سی پیدا ہو رہی تھی اور وہ چہرے سے بہت خوش اور پُرجوش دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے بڑی اپنائیت کے ساتھ "ممی" کہا مگر اس کی آواز اتنی مدھم اور بول اتنے شکستہ تھے کہ شاید وہ خود بھی نہ

سن سکی تھی، انہیں یوں لگا جیسے بچی کے صرف ہونٹ لرز کر رہ گئے ہوں۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اچانک ان کی نظر اس کے لباس اور ہاتھوں پر پڑی جو سیاہی میں بھرے ہوئے تھے۔ وہ یک دم چیخ پڑیں۔ "ارے ارے کیا کر رہی ہو۔ وہیں کھڑی رہو میرے پاس مت آنا۔" انہوں نے اپنے قیمتی کپڑوں پر ایک نظر ڈالی اور پھر اس سیاہی سے بھرے ہوئے ہاتھوں پر اور زور سے چیخیں۔ "بوا اری او بوا کدھر رہ گئیں۔ فوراً ادھر آؤ۔" اور پھر بچی کی طرف متوجہ ہوئیں۔ "یہ کیا کیا تم نے، ہاں کس نے دیئے ہیں تمہیں سیاہی اور قلم...... ابھی میرے کپڑے خراب کر دیتی۔ پاگل لڑکی۔" مسز خالد اسے ڈانٹ رہی تھیں کہ بوا دوڑتی ہوئیں کمرے میں داخل ہوئی۔ "کیا ہوا بیگم صاحبہ...... کیا بات ہے؟" "بوا دیکھو یہ کیا کر رہی ہے۔ کتنی دفعہ کہا کہ اس کا خیال رکھا کرو، ورنہ کسی دن یہ کچھ کر بیٹھے گی۔ لے جاؤ اسے اور نہلا دھلا کر کپڑے بدلواؤ اور خیال رکھو اس کا، میں نصیر صاحب کی بیٹی کی شادی میں جا رہی ہوں، ذرا دیر سے واپس آؤں گی۔" یہ کہہ کر مسز خالد اپنی ساڑھی سنبھالتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ بوا بچی کی طرف مڑی جو ایک کونے میں سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرا رہے تھے اور بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ "گڑیا رانی ادھر آؤ میرے پاس۔" بوا نے نیچے جُھکتے ہوئے دونوں بازو اس کی طرف پھیلاتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔ "ادھر آؤ مجھے دکھاؤ آپ کے ہاتھ میں کیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے بوا نے گڑیا کو گود میں اٹھانا چاہا مگر گڑیا ہاتھ جھٹکتے ہوئے دروازے کی طرف بھاگی اور فرش پر بچھے دبیز قالین میں جذب ہوتے ہوئے آنسو چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ بوا اس کے پیچھے بھاگی اور نہ اسے پیچھے سے آواز دی۔ وہ جانتی تھی کہ اب پکارنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ کوئی پہلی مرتبہ نہیں ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ گڑیا اب خود کو اپنے کمرے میں بند کر لے گی اور اپنی لال پری کے سینے سے لگ کر گھنٹوں پڑی رہے گی۔

گڑیا مسز خالد کی سب سے چھوٹی لڑکی تھی۔ اس سے بڑی دو بہنیں تھیں۔ بارہ سال کی ندا اور سب سے بڑی نادیہ، جس کی عمر پندرہ سال تھی۔ جب گڑیا کی پیدائش ہوئی تو مسز خالد کی بڑی تمنا تھی کہ ان کے ہاں بیٹا ہو۔ گڑیا کے والد خالد سعید صاحب بھی بیٹا چاہتے تھے مگر انہوں نے گڑیا کو کبھی بھی بیزاری کی نظر سے نہیں دیکھا تھا اور وہ اپنی بیٹیوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ مسز خالد بھی بڑی دونوں لڑکیوں سے بہت محبت کرتی تھیں اور نفرت تو انہیں کبھی گڑیا سے بھی نہیں تھی مگر چاہتے ہوئے بھی وہ کبھی گڑیا کے قریب نہ ہو سکیں۔ جسمانی طور پر گڑیا میں کوئی عیب نہ تھا مگر ذہنی طور پر وہ عام انسانوں سے بہت کم تر تھی۔ اس کا دماغ بہت کمزور تھا اور ذہنی صلاحیتیں بھی محدود تھیں۔ جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی دماغی طور پر وہ اپنی عمر سے بہت پیچھے رہ گئی۔ وہ کوئی کام ٹھیک طرح سے نہ کر سکتی تھی۔ چند ٹوٹے پھوٹے الفاظ کے

علاوہ وہ ابھی تک بولنے کی قابل نہ تھی۔ اس کی پیدائش کے کئی ماہ بعد تک مسز خالد بہت بیمار رہی تھیں اور گڑیا کو شروع سے ہی بوا نے پالا تھا۔ مسز خالد جب صحت یاب ہوئیں تو اس وقت تک نہ چاہتے ہوئے بھی وہ گڑیا سے دور ہو چکی تھیں۔ انہوں نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ گڑیا ٹھیک بھی ہو سکتی ہے۔ ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ وہ اب ہمیشہ ایسے ہی رہے گی اور ساری عمر کسی نہ کسی کے لئے مصیبت بنی رہی گی۔

البتہ مسٹر خالد کا پیار گڑیا کے لئے بھی ویسا ہی تھا جیسے دوسری اولاد کے لئے۔ مگر وہ بہت مصروف آدمی تھے جن کا کاروبار ہی اتنا بڑا تھا کہ ان کے پاس گھر کے لئے وقت بہت کم نکلتا تھا۔ نادیہ ایک سمجھدار لڑکی تھی اور گڑیا سے بہت پیار کرتی تھی اور اسے ہمیشہ کچھ نہ کچھ سکھاتی رہتی تھی اور وہ گھر کی وہ واحد ہستی تھی جس کی بات گڑیا سن اور مان لیتی تھی ورنہ وہ اور کسی کی بات سنتی ہی نہیں تھی۔

بوا کمرے سے باہر نکلی تو سامنے نادیہ کھڑی تھی۔ "کیا ہوا بوا یہ گڑیا کو کیا ہوا۔ کیوں یہ اس طرح بھاگتی ہوئی گئی ہے۔" نادیہ بوا سے مخاطب ہوئی۔ "کچھ نہیں بیٹی گڑیا نے اپنے کپڑے اور ہاتھ سیاہی میں بھر لئے تھے جس کی وجہ سے بیگم صاحبہ نے اسے ڈانٹ دیا۔ "او نو...... آج پھر۔" نادیہ زیر لب بڑبڑائی اور گڑیا کے کمرے کی طرف لپکی۔ نادیہ کی توقع کے مطابق کمرہ اندر سے بند تھا۔ نادیہ نے گڑیا کو پکارا اور دو تین دفعہ دروازہ کھٹکھٹایا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ نادیہ جانتی تھی کہ گڑیا اب دروازہ نہیں کھولے گی مگر اس کے دل کا دروازہ نادیہ کے لئے ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ گڑیا کے کمرے کی کھڑکی پائیں باغ میں کھلتی تھی۔ وہ جب بھی ناراض ہو کر کمرے کا دروازہ بند کرتی تو کھڑکی کھول دیتی۔ نادیہ کھڑی کی ذریعے کمرے میں داخل ہو جاتی اور بڑے پیار سے پھر گڑیا کو مناتی۔ کبھی وہ مان جاتی تو اپنا سر نادیہ کی گود میں رکھ کر پڑی رہتی۔ نادیہ اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتی رہتی حتیٰ کہ وہ سو جاتی اور کبھی وہ ضد میں آجاتی اور مان کر نہ دیتی اور پھر اپنی بڑی سے گڑیا کر سینے سے لگا کر بستر پر گر جاتی اور لال پری کا ورد کرتی ہوئی سو جاتی۔

نادیہ کمرے میں کھڑکی کے راستے داخل ہوئی تو گڑیا بستر سے ٹیک لگائے گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی سسکیاں بھر رہی تھی۔ اس کے ارد گرد تمام کمرے میں کاغذ بکھرے پڑے تھے اور جگہ جگہ سیاہی کے دھبے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ نادیہ خاموشی سے چلتی ہوئی گڑیا کے پاس آئی اور اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا کافی دیر تک وہ یونہی گڑیا کو گود میں اٹھائے ٹہلتی رہی۔ جب گڑیا کے آنسو تھمے تو نادیہ کا دایاں شانہ آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا۔ نادیہ نے گڑیا کو گود سے اتارا اور بستر پر بٹھا دیا اور خود قالین پر اس کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ گئی۔ اس نے گڑیا کے آنسوؤں سے تر چہرے کو صاف کیا چہرے پر بکھرے ہوئے بال سمیٹے اور اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے بولی۔

"اب گڑیا بیٹی باجی کو بتائے گی کہ اس کو کیا کیا لکھنا آتا ہے۔" گڑیا نے فوراً سر نفی میں ہلا دیا۔

"بڑی بات ایسے نہیں کرتے۔" نادیہ نے بڑے پیار سے اس کے گال تھپتھپائے اور کاغذ اور قلم اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"یہ لو اب باجی کو لکھ کر دکھاؤ کہ گڑیا کو کیا لکھنا آتا ہے۔" گڑیا نے بہت کوشش کی لکھنے کی مگر اس کے کانپتے ہاتھ کچھ بھی نہ لکھ سکے۔

"اچھا ایسا کرو کہ الف لکھو۔" نادیہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا گڑیا نے الف لکھنے کی کوشش کی مگر اس دفعہ بھی وہ ایک ترچھی سی لکیر کھینچ کر رہ گئی۔ اس نے کتنی محنت سے گڑیا کو لکھنا سکھایا تھا۔ اور گڑیا آہستہ آہستہ لفظ سمجھنے لگی تھی مگر اب پھر وہ ایک سیدھی لکیر بھی کھینچنے سے قاصر تھی۔ نادیہ کو یاد تھا کہ اس نے کیسے گڑیا کو لکھنا سکھایا تھا۔ گڑیا سے ابتدا میں قلم بھی نہیں پکڑا جاتا تھا اور نادیہ گھنٹوں اس کے پاس بیٹھی اسے لکھنے کی مشق کراتی رہتی تھی۔ گڑیا آہستہ آہستہ لفظ دیکھ کر ان کی نقل کرنے لگی تھی گو کہ شکستہ لکھائی میں مگر وہ سیکھنے تو لگی تھی اور وہ دن جب گڑیا نے نادیہ کی دیکھا دیکھی "باجی" صاف صاف لکھ دیا تھا تو نادیہ تو جیسے خوشی سے پاگل ہو گئی تھی۔ اس نے کاغذ گڑیا کے آگے کر دیا اور اسے پڑھنے کو کہا تو وہ کافی دیر تک سوچتی رہی تھی اور پھر آخر کار اس نے "لال پری" کہا تھا اور جب نادیہ نے اس سے بڑے پیار سے پوچھا تھا کہ بتاؤ تمہیں لکھنا کس نے سکھایا تو جواب ملا تھا "لال پری" اب تو نادیہ کو بھی احساس ہونے لگا تھا کہ جیسے اس گھر میں واقعی ہی کوئی لال پری موجود ہو گڑیا کی تو ہر بات کا جواب ہی یہ ہوتا تھا، لال پری...... خالد صاحب کے ایک جملے سے لال پری کیا وجود میں آئی وہ تو گڑیا کے حواس پر چھا گئی تھی۔

ہوا یوں کہ ایک دفعہ خالد صاحب کہیں باہر سے لوٹے تو ایک بہت خوبصورت گڑیا لائے، وہ گڑیا کے کمرے میں گئے تو گڑیا سو رہی تھی۔ وہ اسے گڑیا کے سرہانے رکھ کر باہر آ گئے۔ گڑیا اٹھی تو سرہانے پڑی گڑیا اسے بہت پسند آئی وہ اسے اٹھا کر باہر آ گئی۔ خالد صاحب اس وقت لونگ روم میں بیٹھے چائے پی رہے تھے گڑیا کو خوش دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے اور اسے اپنے پاس بلایا۔ پاس آنے پر انہوں نے گڑیا کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"کیسی ہے...... اچھی لگی"؟

گڑیا نے خوش ہو کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ "اچھا بتاؤ یہ کون لایا ہے" خالد صاحب نے گڑیا کو اٹھا کر اپنی گود میں بٹھا لیا۔ گڑیا چپ چاپ ان کی طرف دیکھتی رہی، "ارے بھئی بتاؤ نا کہ پاپا لائے ہیں...... یا پھر

کوئی لال پری رکھ گئی ہے۔ " انہوں نے ہنستے ہوئے کہا اور گڑیا نہ جانے کہاں کھو گئی پھر اچانک بول پڑی "لال پَلی" اس کی بات پر خالد صاحب بے ساختہ ہنس پڑے اور بولے۔

"نہیں بیٹا لال پری نہیں یہ پاپا لائے ہیں۔ "

مگر گڑیا نے ان کی بات کے جواب میں نفی میں سر ہلا دیا اور دھیرے سے بولی "لال پلی" اور خلد صاحب اس کے بھولے انداز پر قہقہہ مار کر ہنس پڑے اور اسے گلے سے لگاتے ہوئے بولے

"ٹھیک ہے بھئی یہ گڑیا آپ کی لال پری ہی لائی ہے۔ "

اس وقت تو سب کو گڑیا کا یہ انداز بہت پسند آیا مگر یہ لال پری سب کے حواس پر چھاتی چلی گئی۔ گڑیا کے پاس تو ہر بات کا جواب لال پری ہی ہوتا تھا۔ جس کے ساتھ وہ پہروں باتیں کرتی رہتی۔ اب وہ اپنے کمرے کی چیزیں خود ٹھیک کرنے لگی تھی۔ اس سے پوچھو کہ یہ صفائی کس نے کی ہے جواب ملتا "لال پری نے۔ " کوئی مہمان پوچھتا یہ خوبصورت کپڑے کس نے دلائے ہیں تو جواب میں پھر لال پری۔ غرض یہ کہ اس لال پری کی گردان سے اب سب تنگ آگئے تھے اور کئی دفعہ مسز خلد سخت غصے میں آجاتی تھیں۔ گڑیا دسترخوان پر کھانا نہ کھاتی تھی۔ بلکہ اپنے کمرے میں کھاتی اور وہ بھی نادیہ یا بُوا کے ہاتھ سے۔ اس کے ہاتھ میں نوالہ یا چمچہ تھماتے تو گرا دیتی۔ نادیہ نے بڑی محبت اور محنت سے اسے خود اپنے ہاتھوں سے دسترخوان کے آداب سکھائے۔ جو گڑیا نے آہستہ آہستہ سیکھ لئے۔ ایک دن بُوا نے خود گڑیا کو خود کھانا کھاتے دیکھ لیا تو وہ حیران رہ گئیں اور انہوں نے گڑیا سے پوچھنا چاہا مگر ان کے پوچھنے سے پہلے وہ بول پڑی۔ "لال پری۔ " جب نادیہ نے محسوس کیا اب گڑیا ہر چیز خود سنبھال لیتی ہے تو ایک دن لنچ پر جب سب موجود تھے تو اس نے گڑیا کو اپنے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا لیا اور مسز خالد سے بولی "دیکھیں امی اب گڑیا خود سے کھانا کھا سکتی ہے۔ " یہ بات سن کر وہ حیران ہوئیں تھیں مگر ان کے چہرے پر بڑی بے یقینی کے آثار تھے۔ نادیہ نے سالن کا ڈونگا گڑیا کی طرف کھسکا دیا "یہ لو ڈالو" گڑیا نے ڈرتے ڈرتے ڈونگا اٹھایا اور مسز خالد کی طرف دیکھا ان کے چہرے پر بے یقینی کا عالم تھا۔ گڑیا کے ہاتھ کانپنے لگے اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے لہرائے اور اس سے پہلے کہ نادیہ ڈونگا پکڑتی وہ گڑیا کے ہاتھ سے گر چکا تھا۔ تمام سالن بکھر گیا تھا۔ گڑیا نے ایک چیخ ماری اور دسترخوان چھوڑ گئی۔ نادیہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس چیز کی کمی رہ جاتی ہے۔ اس کی اتنی محنت کے بعد بھی گڑیا میں اعتماد پیدا نہیں ہو سکا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں ہوتی تو ہر کام کر لیتی۔ اپنے کمرے کو سنوار بھی لیتی۔ اپنے کپڑے اور کھلونے سنبھال لیتی۔ اب وہ خود کپڑے بھی تبدیل کرنے لگی تھی مگر اس کے ساتھ ساتھ لال پری کی گردان بھی بڑھتی رہی تھی، جیسے اس کی زندگی کی ہر آتی جاتی سانس لال پری ہی کی مرہون منت ہو۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ

وہ سب گھر والوں سے دور ہوتی جارہی تھی اور اب وہ لوگ سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور ہوگئے تھے کہ اگر گڑیا کی محبت اسی طرح لال پری کے ساتھ بڑھتی گئی تو وہ یقیناً پاگل ہو جائے گی۔

نادیہ نے سوچ لیا تھا کہ اب اسے کوئی قدم اٹھانا پڑے گا۔ وہ ممی ڈیڈی سے کھل کر بات کرے گی۔ وہ کافی دیر گڑیا کا سر اپنی گود میں رکھے سہلاتی رہی اور جب گڑیا سو گئی تو وہ اسے بستر پر ڈال کر اپنے کمرے میں آگئی۔ وہ خود کو بہت تھکا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ کافی دیر اس کا ذہن مختلف خیالات میں اُلجھا رہا اور پھر اسے بھی نیند آگئی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو شام ڈھل چکی تھی۔ وہ کمرے سے نکل کر لونگ روم میں آگئی۔ مسز خالد تقریب سے واپس آچکی تھیں اور اپنا ایک بہت ہی قیمتی لاکٹ ڈھونڈ رہی تھیں جو تقریب پر جانے سے پہلے اپنے خیال میں سنگھار میز پر چھوڑ گئیں تھیں۔ مگر وہ اب وہاں نہیں تھا۔ خالد صاحب بھی دفتر سے واپس آچکے تھے اور ایئرپورٹ جانے کے لئے تیار تھے۔ انہیں کاروبار کے سلسلے میں بیرون ملک جانا تھا۔ انہوں نے گھڑی دیکھی اور نادیہ سے مخاطب ہوئے۔ "نادیہ بیٹے مجھے دیر ہو رہی ہے کہیں فلائٹ ہی نہ مس ہو جائے تم ذرا جلدی سے دیکھو کہ گڑیا کہاں ہے؟" یہ کہہ کر وہ اپنا ٹکٹ اور پاسپورٹ چیک کرنے لگے۔ نادیہ گڑیا کے کمرے میں پہنچی تو گڑیا وہاں نہ تھی۔ کمرہ بھی صاف ستھرا لگ رہا تھا۔ تمام کاغذ اٹھا لئے گئے تھے۔ وہ گڑیا کو آوازیں دیتی ہوئی واپس آئی تو گڑیا خالد صاحب کی گود میں تھی۔ انہوں نے گڑیا کو پیار کیا۔ نادیہ اور ندا کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اپنا بریف کیس اٹھاتے ہوئے بولے "اچھا بھئی میں چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ مڑے ہی تھے کہ گڑیا نے ان کی ٹانگ پکڑ لی۔ گویا وہ روک رہی تھی۔ خالد صاحب نے پیار سے اسے علیحدہ کرنا چاہا مگر وہ تو جیسے ضد میں آئی ہوئی تھی۔ خالد صاحب نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ٹکٹ اور پاسپورٹ میز پر رکھ دیا۔ گڑیا کے ماتھے پر پیار سے بوسہ دیا اور اسے خود سے علیحدہ کرتے ہوئے بولے "دیکھو بیٹا مجھے دیر ہو رہی ہے میں جلد آجاؤں گا اور آپ کے لئے بہت سے کھلونے لاؤں گا۔" یہ کہہ کر انہوں نے میز پر سے ٹکٹ وغیرہ اٹھانا چاہا کہ اچانک گڑیا نے جھپٹ کر ٹکٹ اٹھایا اور اندر کی طرف بھاگ گئی۔ ارے ارے دیکھو پکڑو اس پگلی کو مجھے پہلے ہی بہت دیر ہوگئی ہے۔" خالد صاحب چیخے اور نادیہ، ندا اور تمام ملازم گڑیا کے پیچھے بھاگے۔ جلد ہی وہ اسٹور روم میں ایک بڑے سے ٹب کے پیچھے چھپی ہوئی مل گئی مگر ٹکٹ اس کے پاس نہیں تھا۔ "ٹکٹ کہاں ہے۔" نادیہ نے گڑیا کو بازوؤں سے پکڑ کر بالکل اپنے قریب کر لیا۔ گڑیا نے انگلی سے چھت کی طرف اشارہ کیا اور بولی "لال پری۔" ملازم ایک ایک چیز الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے اور نادیہ پیار سے کبھی غصے سے گڑیا سے اگلوانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر ہر بار اس کا جواب لال پری ہی ہوتا تھا۔ اِتنے میں خالد صاحب بھی وہاں پہنچ گئے۔ اس موقع پر جب انہوں نے گڑیا کے منہ سے لال پری کا لفظ سنا تو غصے سے

ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "بکواس بند کرو میں اب یہ لفظ سننا نہیں چاہتا۔" وہ زور سے دہاڑے۔ انہیں اب فلائٹ مس ہونے کی کوئی پروانہ تھی۔ انہوں نے گڑیا کو بازو سے پکڑا اور گھسیٹتے ہوئے لونگ روم میں لے آئے۔ "آج میں دیکھتا ہوں کہ تم کیسے اس لال پری کو اپنے ذہن سے نہیں نکالتیں۔ آج کے بعد تم یہ نام اپنی زبان پر نہیں لاؤ گی۔" وہ غصے سے چیخ رہے تھے اور گڑیا بار بار لال پری لال پری دہرائے جا رہی تھی۔

مسز خالد اس واقعہ سے بے خبر اپنا لاکٹ ڈھونڈنے میں مصروف تھیں۔ "ضرور یہ گڑیا نے چھپا دیا ہو گا۔ کیونکہ میرے جاتے وقت وہ ہی کمرے میں موجود تھی۔" گڑیا کے کمرے میں قدم رکھتے وقت انہوں نے سوچا اور ادھر نظریں دوڑانے لگیں۔ جب سامنے کہیں نظر نہ آیا تو انہوں نے الماری کھولی اور مختلف خانوں میں دیکھنے لگیں۔ ایک دراز کھولی تو وہ بے شمار مڑے تڑے کاغذوں سے بھری پڑی تھی۔ وہ سفید کاغذوں کو ہٹا کر دیکھنے لگیں کہ ان کی نظر بڑے زرد رنگ کے کاغذ پر پڑی اور انہیں وہ وقت یاد آگیا جب گڑیا زرد رنگ کا کاغذ تھامے ان کے پاس آئی تھی۔ انہوں نے کاغذ اٹھایا کھولا اور جیسے ہی ان کی نظر اندر عبارت پر پڑی انہیں ایک شدید دھچکا لگا۔ انہوں نے دوسرا کاغذ اٹھایا پھر تیسرا پھر چوتھا جیسے جیسے وہ کاغذ کھول کر پڑھتی گئیں، ان کی حالت غیر ہوتی گئی۔ ان کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے اور انہیں اپنا سارا وجود زلزلے کے جھٹکوں کی زد میں محسوس ہو رہا تھا۔ انہیں اپنے اندر ایک خول سا ٹوٹتا محسوس ہوا اور دھندلائے ہوئے رشتوں کے چہروں پر سے دھند سی چھٹنے لگی۔ ٹوٹی پھوٹی شکستہ لکھائی میں ہر کاغذ پر جگہ جگہ ایک ہی لفظ تحریر تھا۔ "ممی"۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی لکھنے کی مشق کرتا رہا ہو اور بڑے زرد کاغذ پر درمیان میں قدرے بہتر اور صاف رائٹنگ میں بڑا سا لکھا تھا۔ "میری ممی" جو ایک طویل مشق کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ مسز خالد کا سر کھلی دراز کے ساتھ ٹکا ہوا تھا اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے جیسے کوئی سیلاب بند توڑ کر بپھر جاتا ہے۔ گزرے ہوئے ماہ و سال کا ایک ایک واقعہ کسی فلم کے سین کی طرح ان کی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہا تھا اور ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ان بے خبر لمحوں کا حساب کیسے دیں گی؟ وہ سوچوں میں غرق تھیں کہ خالد صاحب کی بلند آواز نے انہیں چونکا دیا۔ وہ زور زور سے گڑیا کو ڈانٹ رہے تھے۔ وہ تڑپ کر اس آواز کی سمت لپکیں۔ وہ لونگ روم میں داخل ہوئیں تو غصے کے مارے خالد صاحب کا چہرہ دھواں دھواں تھا اور وہ گڑیا کو شانوں سے پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے چلا رہے تھے۔ "مت لو یہ منحوس نام میرے سامنے۔" اور پھر اس سے پہلے کہ مسز خالد کچھ کہتیں خالد صاحب کا بایاں ہاتھ گھوما اور اس زناٹے سے گڑیا کے گال پر پڑا کہ وہ اچھل کر دور جا گری۔ نادیہ کے منہ سے چیخ نکل گئی اور قریب تھا کہ گڑیا کا سر دیوار کے ساتھ ٹکراتا ممی نے لپک کر اسے دبوچ لیا اور اپنی باہوں

میں سمیٹ کر سینے سے لگا لیا۔ گڑیا روتے روتے اچانک چپ ہوئی۔ اس نے سر اٹھا کر ممی کی اشکبار آنکھوں میں جھانکا تو اسے وہاں اپنی بیتی ہوئی ساری زندگی کے ان گنت سوالات کے تمام جواب دکھائی دیئے۔ اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ پوری طرح لب وا کئے اور بولی "میری اچھی ممی"۔ نادیہ کو احساس ہوا کہ اس کی برسوں کی محنت میں کس چیز کی کمی تھی ...... ممتا کی۔

یہ خطرناک کھیل اسپین میں بہت مقبول ہے۔
کھلاڑی سانڈ کے آگے سرخ کپڑا لہراتا ہے اور سانڈ حملہ آور ہو جاتا ہے۔
ایسے ہی ایک حملے میں سانڈ نے کھلاڑی کو اپنی سینگوں پر اٹھا رکھا ہے!

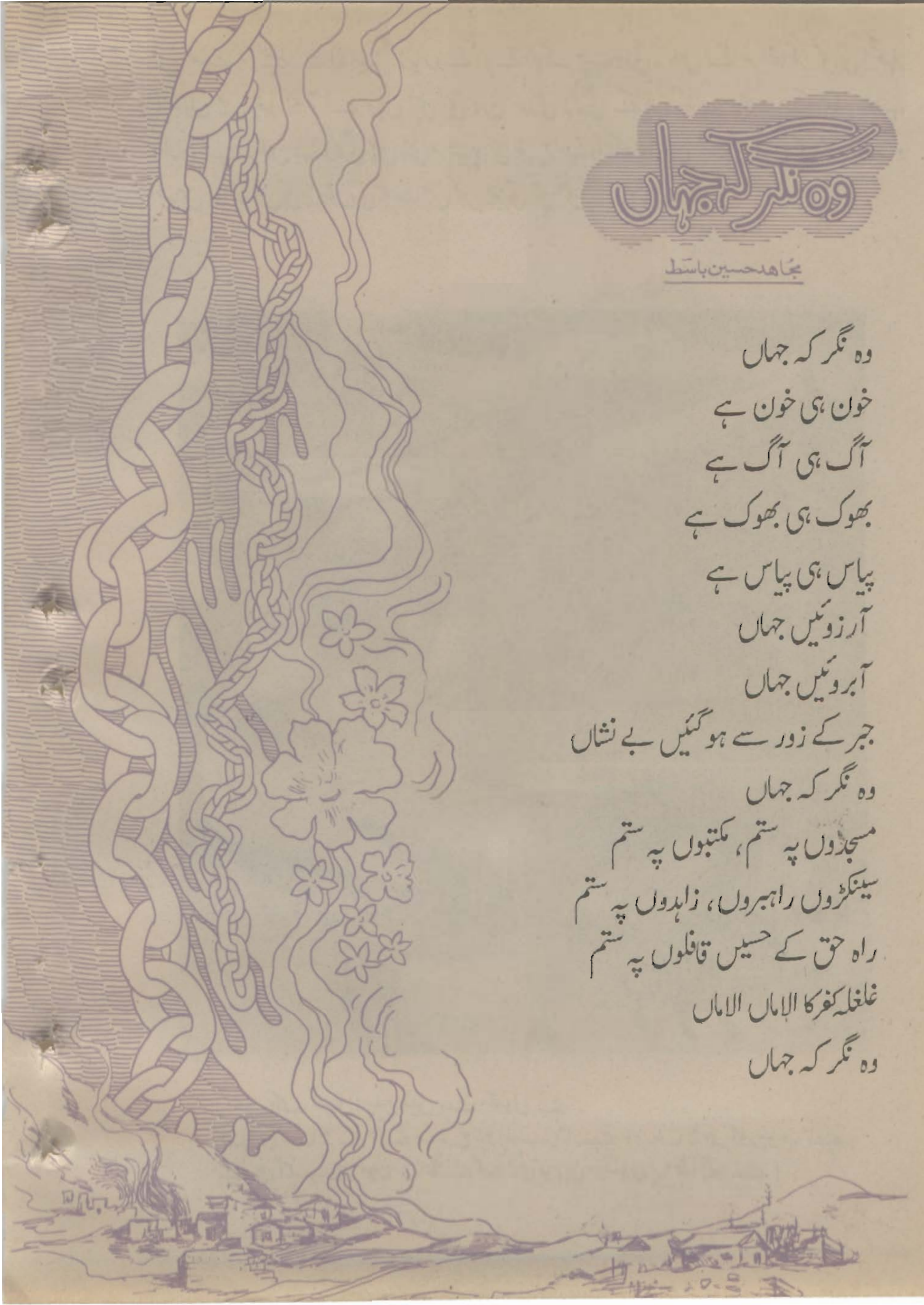

وہ نگر کہ جہاں

مجاہد حسین باسط

وہ نگر کہ جہاں
خون ہی خون ہے
آگ ہی آگ ہے
بھوک ہی بھوک ہے
پیاس ہی پیاس ہے
آرزوئیں جہاں
آبروئیں جہاں
جبر کے زور سے ہو گئیں بے نشاں
وہ نگر کہ جہاں
مسجدوں پہ ستم، مکتبوں پہ ستم
سینکڑوں راہبروں، زاہدوں پہ ستم
راہ حق کے حسیں قافلوں پہ ستم
غلغلہ کفر کا الاماں الاماں
وہ نگر کہ جہاں

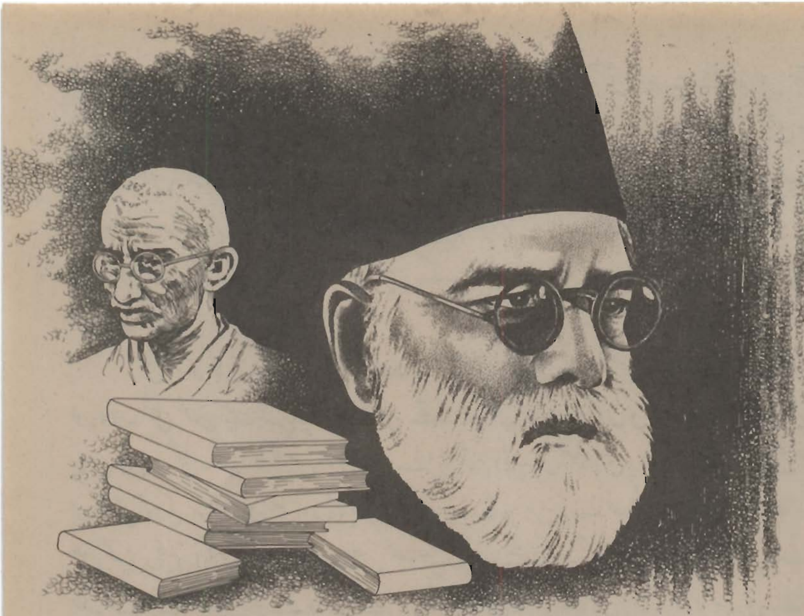

عبدالحق سے بابائے اردو تک

طاہر مسعود

اب سے ایک صدی قبل کا واقعہ ہے۔

شمالی ہندوستان کے قصبے ہاپوڑ کے ایک متوسط گھرانے میں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام والدین نے عبدالحق رکھا۔ عبدالحق نے بچپن ہی سے سنجیدہ طبیعت پائی تھی۔ ان میں عام لڑکوں والی کوئی بات نہیں تھی۔ کھیل کود سے، شرارتوں سے، اور دوستوں میں وقت ضائع کرنے سے انہیں بالکل دلچسپی نہیں تھی۔ ان کا ایک ہی مشغلہ تھا، ہروقت کتابیں پڑھنا۔ پہلے پہل تو گھر والوں کو یہ عادت کھٹکتی تھی پھر انہوں نے عبدالحق کی اس عادت سے سمجھوتہ کرلیا۔

ایک دن بظاہر ایک معمولی سا واقعہ پیش آیا لیکن اس واقعہ نے عبدالحق کی زندگی پر دور رس اثرات مرتب کئے۔ ہوا یہ کہ عبدالحق کو اپنے ایک ہم جماعت کے گھر سے ایک رسالہ ملا۔ رسالے کا نام تھا، "تہذیب الاخلاق۔" اب یہ تو سبھی کو معلوم ہے کہ "تہذیب الاخلاق" سرسید احمد خان کا رسالہ

تھا۔ اس زمانے میں سرسید مسلمانوں میں تعلیم کی روشنی پھیلانے کی کوشش کر رہے تھے اور اس مقصد کے لئے وہ علی گڑھ کا مدرسہ قائم کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے "تہذیب الاخلاق" بھی جاری کر رکھا تھا۔ اس رسالے کے ذریعے وہ مسلمانوں کو ایک مہذب اور متمدن قوم بنانا چاہتے تھے۔ عبدالحق نے یہ رسالہ پڑھا تو سرسیّد کے مضامین نے ان کے دل پر گہرا اثر کیا۔ اور انہوں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ آئندہ تعلیم سرسید ہی کے ادارے میں حاصل کریں گے۔ چنانچہ مڈل کا امتحان پاس کرنے کے بعد عبدالحق نے علی گڑھ کالج میں داخلہ لے لیا۔

علی گڑھ کالج سے ان دنوں نہایت عالم فاضل ہستیاں وابستہ تھیں۔ اساتذہ میں پروفیسر آرنلڈ اور علامہ شبلی نعمانی جیسے بلند پایہ اسکالر شامل تھے۔ عبدالحق کو ان بزرگوں کی صحبت اور شفقت ملی تو علم کی پیاس اور بڑھ گئی۔ لہٰذا کالج میں بھی انہوں نے اپنی تمام دلچسپیاں تعلیم ہی پر مرکوز رکھیں۔ کالج میں یونین اور کھیل کود کی سرگرمیوں میں وہ کبھی شریک نہیں ہوئے۔ سرسید نے عبدالحق کی سنجیدہ طبیعت اور مطالعہ میں گہری دلچسپی دیکھی تو ان کی تربیت میں خصوصی دلچسپی لینے لگے۔ گرمیوں کی تعطیلات میں جب سارے طلبہ اپنے اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے، عبدالحق کا قیام ہاسٹل ہی میں رہتا۔ وہ لائبریری سے ڈھیروں کتابیں جاری کرا لیتے اور بیشتر وقت ان کے مطالعہ میں گزارتے تھے۔ سرسید بھی ان سے اپنے رسالے "تہذیب الاخلاق" کے لئے مضامین وغیرہ لکھوانے کا کام لیا کرتے تھے۔ عبدالحق نے کالج ہی کے زمانے سے علمی مضامین لکھنے شروع کر دیئے تھے۔ ان کے مضامین ملک کے اعلیٰ معیار کے جریدوں کی زینت بنتے تھے۔ اس وقت ان کی عمر بہت کم تھی لیکن مطالعہ اتنا وسیع ہو چکا تھا کہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے، معلومات کے انبار لگا دیتے تھے۔ چنانچہ کالج میں مقابلہ مضمون نگاری ہوا تو ان کا مضمون سب سے عمدہ قرار پایا اور انہیں انعام میں میڈل دیا گیا۔ عبدالحق میں اتنا اعتماد تھا کہ انہوں نے ایک مرتبہ اپنے استاد علامہ شبلی نعمانی کے ایک مضمون پر کڑی تنقید کی اور ان کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا۔

کالج سے بی۔اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد عبدالحق مسلمانوں کے مشہور رہنما نواب محسن الملک کے پرائیویٹ سیکرٹری ہو گئے۔ یہ ملازمت گویا ان کی عملی زندگی کا آغاز تھا۔ پھر کچھ ہی دنوں بعد وہ حیدر آباد دکن چلے گئے اور وہاں مدرسہ آصفیہ میں صدر مدرس مقرر ہوئے۔ اور پھر وہاں سے نکلنے والے ایک رسالے "افسر" کی ادارت بھی سنبھال لی۔ یہ رسالہ فوجی مضامین کے لئے مخصوص تھا۔ عبدالحق نے اسے ایک علمی رسالہ بنا دیا اور بہترین مضمون پر ایک اشرفی انعام میں دینے کا اعلان کیا۔ چنانچہ "افسر" جو پہلے ایک گمنام رسالہ تھا، دیکھتے ہی دیکھتے پڑھنے والوں میں مقبول ہو گیا اور اس میں

نہایت اہم علمی، ادبی اور تاریخی مضامین چھپنے لگے۔ عبدالحق کچھ ہی عرصہ بعد صوبہ اورنگ آباد کے صدر مہتمم تعلیمات مقرر کر دیئے گئے۔ ان کی زندگی میں ایک اہم موڑ اس وقت آیا جب ۱۹۱۲ء میں انہیں انجمن ترقی اردو کا سیکرٹری چنا گیا۔ انجمن ترقی اردو دراصل اردو زبان کی حفاظت اور اس کو ترقی دینے کے خیال سے بنائی گئی تھی۔ اس کے پہلے سیکرٹری علامہ شبلی نعمانی تھے۔

عبدالحق انجمن ترقی اردو کے سیکرٹری مقرر ہوئے تو انجمن کی حالت نہایت خستہ تھی۔ اس کے پاس نہ اپنا کوئی سرمایہ تھا اور نہ اس وقت تک کسی کو اس سے کوئی خاص دلچسپی باقی رہ گئی تھی۔ عبدالحق کی زندگی میں انجمن نے اتنی اہمیت اختیار کی کہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد بن گئی۔ عبدالحق کے سامنے یہ تو واضح تھا کہ انجمن ترقی اردو کے ذریعے انہیں اردو کی کیا خدمت کرنی ہے، انہیں معلوم تھا کہ اردو زبان ابھی تک علمی اور سائنسی زبان نہیں بن سکی ہے۔ اس میں یہ صلاحیت پیدا کرنی ہے کہ وہ جدید علوم اور اس کے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ اس کے لئے ان علوم پر زیادہ سے زیادہ کتابیں چھاپنے کی ضرورت تھی لیکن کتابیں چھپوانے کے لئے انجمن کے پاس پیسے کہاں تھے۔ عبدالحق نے علی گڑھ کالج کے زمانے ہی میں سرسید کو کالج کے لئے چندہ لیتے ہوئے دیکھا تھا۔ چنانچہ جہاں تک ہو سکا وہ اپنی جیب سے کتابیں چھپوانے کے لئے پیسے خرچ کرتے رہے اور پھر لوگوں سے چندہ لینے کا فیصلہ کیا۔ لیکن لوگوں سے چندہ نکلوانا آسان کام نہیں تھا۔ جیسا کہ انہوں نے بعد میں لکھا،

> "چندہ دینا آسان ہے، چندہ لینا بہت مشکل ہے۔ چندہ لینے والا آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے اور لوگ اس کی صورت سے بیزار ہوجاتے ہیں۔ برخلاف اس کے چندہ دینے والے کی ہر جگہ عزت و توقیر ہوتی ہے۔"

ان احساسات کے باوجود عبدالحق ڈھیٹ بن کر چندہ مانگتے رہے اور دو سال کی مدت میں آٹھ ہزار روپیہ کی رقم جمع کرلی۔ اس عرصے میں انہوں نے مغربی علوم کی کئی معیاری کتابیں چھاپیں جس سے انجمن کی علمی شہرت کا آغاز ہوا۔

ان دنوں عبدالحق کا دفتر اورنگ آباد کے مقبرہ رابعہ دورانی (وہی مقبرہ جس کی عمارت بالکل تاج محل جیسی ہے) کے عقب میں تھا۔ وہاں کوئی آبادی نہ تھی اور وہاں تک پہنچنے کے لئے کوئی سڑک بھی نہیں بنی تھی۔ عبدالحق دن رات محنت کرتے تھے۔ انہوں نے انجمن کو مالی اعتبار سے مضبوط بنایا۔ انجمن کی شاخیں ملک بھر میں قائم کیں جس کے تحت انجمن کے جلسے ہونے لگے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک تنخواہ دار آدمی مقرر کیا جس کا کام تھا کہ وہ ایسے علاقوں کا دورہ کرے جہاں اردو کا رواج کم ہے اور

پھر رپورٹ دے تاکہ وہاں اردو کی ترقی کے لئے کام کیا جاسکے۔ گویا ایک طرف عبدالحق عوامی سطح پر اردو کی خدمت کیلئے کمربستہ تھے تو دوسری طرف تاریخ، سوانح، تذکرہ اور فلسفہ کے موضوعات پر انگریزی سے ترجمے اور طبع زاد کتابیں بھی چھاپ رہے تھے۔ یاد رہے کہ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان میں اردو کے مقابلے پر ہندی زبان کو آگے بڑھانے کی کوششیں شروع ہو چکی تھیں۔ اور خطرہ یہ تھا کہ اردو کی پشت پناہی نہ کی گئی تو اسے پیچھے دھکیل کر ہندی کو آگے بڑھا دیا جائے گا۔ اسی لئے عبدالحق کی کوشش تھی کہ اردو کو عوام کی سطح پہ بھی مقبول بنایا جائے اور اسے علمی اعتبار سے بھی مستحکم کیا جائے۔

عبدالحق نے محسوس کیا کہ اردو زبان کو ایک جدید زبان بنانے میں انگریزی اصطلاحات بڑی رکاوٹ ہیں کیونکہ ان اصطلاحات کا اردو میں ترجمہ نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ انہوں نے علمی اصطلاحات کی ایک لغت مرتب کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ انہوں نے علمی اصطلاحات کے علاوہ اردو، انگریزی لغت پر بھی کام شروع کر دیا۔ ان کی ان کوششوں کے نتیجے میں حیدر آباد دکن میں ایک نئی یونیورسٹی (عثمانیہ یونیورسٹی) کی تجویز منظور ہوئی جس میں تعلیم کی زبان اردو قرار پائی۔ یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔ لیکن اعلیٰ تعلیم کے لئے اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے میں وہی اصطلاحات اور ان کے ترجموں کی دشواری حائل تھی، پھر یہ کہ نصابی کتب کی تیاری کا بھی مسئلہ تھا۔ جس کے لئے انگریزی سے علمی اور سائنسی کتابوں کا ترجمہ ضروری تھا۔ لہٰذا اس مقصد کے لئے ایک دارالترجمہ قائم کیا گیا اور اس کا سربراہ عبدالحق کو بنایا گیا۔ اس ادارے نے بہت اہم کام انجام دیئے اور اسی کی خدمات کی بدولت عثمانیہ یونیورسٹی میں تمام مضامین کی تعلیم اردو زبان میں دی جانے لگی۔

عبدالحق نے اردو کو علمی زبان بنانے کے لئے متعدد رسائل بھی جاری کئے۔ ان رسائل میں سہ ماہی رسالہ "اردو"، "سائنس"، "معاشیات" اور پندرہ روزہ "ہماری زبان" شامل ہیں۔ یہ چاروں رسالے اپنے اپنے موضوعات پر بے حد اہمیت رکھتے تھے۔ رسالہ "اردو" کو منشی پریم چند نے اردو رسالوں کا قائد قرار دیا۔ کیونکہ اس کے مضامین اتنے معیاری اور بلند پایہ ہوتے تھے کہ کئی مضامین تو علیحدہ کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے اور ان میں بعض کی تو تاریخی اہمیت ہے۔ اسی طرح "سائنس" اور "معاشیات" کے موضوعات پر اردو زبان میں رسالے موجود ہی نہیں تھے۔ ان رسالوں کی وجہ سے ان موضوعات پر اردو میں لکھنے کا رجحان پیدا ہوا۔ ورنہ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ سائنس اور معاشیات جیسے خشک موضوعات پر اردو میں لکھا ہی نہیں جاسکتا۔ "ہماری زبان" نے ہندوستان میں اردو زبان کے دفاع کی جنگ لڑی اور اردو کے مخالفین کے دانت کھٹے کر دیئے۔

عبدالحق کا ایک اہم علمی کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اردو زبان کی تاریخ کے بارے میں بعض

مفروضوں کو غلط ثابت کردیا۔ مثلاً عام خیال تھا کہ اردو زبان مغل بادشاہوں کے دور حکومت میں وجود میں آئی ہے۔ عبدالحق نے تحقیق سے بتایا کہ اردو زبان پہلے مغل بادشاہ بابر سے بھی سو سال پہلے ہندوستان میں بولی اور لکھی جاتی تھی۔ انہوں نے سب سے اہم علمی خدمت یہ کی کہ اردو زبان کے قدیم شاعروں کے تذکرے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے اور انہیں چھپوایا۔ چونکہ پہلے چھاپہ خانے نہیں ہوتے تھے اس لئے شاعر و ادیب حضرات کے مسودات قلم سے لکھے ہوئے ہوتے تھے۔ ایسے لاتعداد قلمی مسودات غیر معروف خانقاہوں میں پرانی بوریوں میں بند پڑے تھے۔ عبدالحق نے انہیں ڈھونڈ نکالا۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جن کو پڑھنا اور سمجھنا ممکن نہیں تھا۔ عبدالحق نے انہیں پڑھا اور سمجھا اور پھر انہیں تصحیح و وضاحت کے ساتھ اس طرح چھپوایا کہ دوسرے بھی پڑھ کے سمجھ سکیں۔ ان کی اس خدمت سے اردو زبان و ادب کی تاریخ کا اہم ترین حصہ ضائع ہونے سے بچ گیا۔

عبدالحق کی علمی اور عملی جدوجہد کے بعد اردو زبان ایک ترقی یافتہ اور جدید زبان کی صورت میں سامنے آئی تو ہندوستان میں متعصب اور فرقہ پرست ہندوؤں نے کانگریس کے پلیٹ فارم سے اس زبان کی مخالفت شروع کردی۔ مخالفت کی وجہ یہ خیال تھا کہ آئندہ جب کسی ہندوستانی زبان کو سرکاری اور قومی زبان بنانے کا سوال درپیش ہو تو کہیں اردو یہ جگہ نہ لے لے۔ اس لئے کانگریس نے ابتدا ہی میں یہ وضاحت کردی کہ ہندوستان کی آئندہ زبان ہندی ہوگی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس تحریک کو مہاتما گاندھی کی سرپرستی حاصل تھی۔ گاندھی جی نے اردو کی مخالفت یہ کہہ کر کی کہ "اردو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے اور قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔" عبدالحق اس صورتحال میں بھلا کیسے خاموش رہ سکتے تھے وہ اردو کے دفاع کے لئے میدان سیاست میں اتر گئے۔ اور تحریر و تقریر دونوں ذریعوں سے انہوں نے اردو کا ایسا دفاع کیا کہ اچھے اچھوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ گاندھی جی سے خط و کتابت اور جلسے جلوسوں کے ذریعے انہوں نے اردو کے حق میں فضا ہموار کردی۔ عبدالحق کا کہنا تھا کہ اردو ہندوستان کی واحد مشترکہ زبان ہے اور یہ ہندوستان میں سب قوموں کے اتحاد کا ذریعہ ہے اور اس زبان کو بنانے میں ہندوؤں کا اتنا ہی حصہ ہے جتنا مسلمانوں کا۔ ان کے دلائل اتنے قوی تھے کہ آخر کار ہندوؤں کے رہنما بابو راجندر پرشاد اور عبدالحق کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس میں اردو کی اہمیت کو تسلیم کرلیا گیا۔

انجمن ترقی اردو کا دفتر اورنگ آباد سے دہلی منتقل ہوگیا تھا۔ لیکن جب پاکستان کے قیام کا اعلان ہوا تو فسادیوں نے عبدالحق کا یہ دفتر لوٹ لیا۔ سیکڑوں قیمتی کتابیں برباد ہوگئیں۔ عبدالحق نے اردو کے مفاد میں پہلے ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا لیکن ہندوستانی حکومت انہیں برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ جس کے بعد وہ ہجرت کرکے کراچی چلے آئے۔ عبدالحق فسادات کے صدموں سے چور تھے لیکن

انھوں نے ہمت نہ ہاری اور ایک بار پھر انجمن کے دفتر اور کاموں کو منظم کیا۔ رسائل جاری کئے اور اس نئی مملکت میں اردو زبان کی ترقی کے لئے کوشاں ہوگئے۔ ان ہی کوششوں کی بدولت کراچی میں اردو کالج قائم ہوا۔ بعد میں اردو سائنس کالج کی بنیاد رکھی گئی۔ عبدالحق نے اردو یونیورسٹی قائم کرنے کی بھی ایک تحریک شروع کی تھی جو افسوس تکمیل تک نہ پہنچ سکی۔ انھوں نے اردو کو سرکاری زبان بنانے کے لئے بھی بہت جدوجہد کی لیکن ان کا یہ خواب بھی پورا نہ ہوسکا۔

عبدالحق نے اپنی ساری زندگی اردو زبان کی خدمت کے لئے وقف کردی تھی۔ سرسید سے انھوں نے ایک بامقصد زندگی گزارنے کا جو فن سیکھا تھا، اس پہ وہ ساری عمر کاربند رہے۔ انہیں وقت ضائع کرنا بالکل پسند نہیں تھا۔ وہ ایسے نوجوانوں کو سخت ڈانٹ ڈپٹ کرتے تھے جو فضول قسم کی گپ شپ اور بیکار کاموں میں وقت ضائع کرتے رہتے ہیں۔ آج دنیا میں جہاں کہیں بھی اردو بولی سمجھی اور پڑھی جاتی ہے، عبدالحق کو "بابائے اردو" کے لقب سے یاد کرنے والے بھی وہاں موجود ہیں۔ اس لئے کہ اردو زبان پر اگر کسی فرد واحد کے سب سے زیادہ احسانات ہیں تو وہ عبدالحق ہی کے ہیں۔ اور یوں ہر وقت پڑھنے کے جنون میں مبتلا اس لڑکے کو آج ہم اس کی کتابوں، رسالوں اور لغات میں پڑھتے ہیں۔

ایسی جلدی بھی کیا ہے

تحمل کے ساتھ
کھانے کی عادت
آپ کی صحت
کی ضامن ہے۔

اپنا گھر

محمد عمر احمد خان

گلیوں اور بازاروں میں بہت ہجوم تھا۔ دکانیں، گلیاں اور بازار رنگ برنگی پاکستانی پرچم والی جھنڈیوں سے سجے ہوئے تھے۔ بچے بالے سر پر پاکستانی پرچم والا تاج پہنے ہنسی خوشی ادھر اُدھر گھوم پھر رہے تھے۔ ان کے سینوں پہ "آئی لو پاکستان" اور "میں بھی پاکستان ہوں" کے بیج لگے ہوئے تھے۔ کاروں اور بسوں سے لے کر رکشا، تانگہ، موٹر سائیکل، سائیکل، ہر دوسری سواری پر پاکستانی پرچم لہرا رہا تھا۔

انڈین گانوں کی جگہ ہوٹلوں، گاڑیوں اور گھروں میں ایک ہی ملی نغمہ گونج رہا تھا۔

دل دل پاکستاں، جاں جاں پاکستاں

آج ۱۴ اگست کا دن تھا۔ گھر میں پڑے پڑے مجھے بوریت ہو رہی تھی، چنانچہ میں نے اسکوٹر باہر نکالی، گھر کو تالا لگایا اور آزادی کی خوشیاں منانے والے رنگ و خوشبو میں ڈوبے شہر کراچی کی رونق دیکھنے نکل پڑا۔ ابھی میں سڑک پر پہنچا ہی تھا کہ ایک لڑکا اسکوٹر چلاتا ہوا تیزی کے ساتھ مجھے کراس کرتا ہوا آگے نکل گیا۔ میں نے دیکھا وہ ہاف آستین کی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ شرٹ کے پیچھے پاکستان کا فلیگ بنا ہوا تھا جس پر لکھا تھا، "میرا دل پاکستان ہے۔"

تھوڑی دیر بعد ایک مزدا نے میری موٹر سائیکل کو کراس کیا۔ اس میں "یہ وطن تمہارا ہے، تم ہو

پاسباں اس کے" کا نغمہ گونج رہا تھا۔ مزدا کے چاروں کونوں میں پاکستان کے جھنڈے ہوا میں لہرا رہے تھے۔

شام ہو چلی تھی۔ رنگ برنگے قمقمے اور تیز لائٹیں جل اٹھی تھیں۔ کراچی روشن ہو چکا تھا اور رنگ و نور کے اس سیلاب کو ٹریفک کا سیلاب حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔

میں ناظم آباد نمبر۔ ۷ کے قریب پہنچا تو پل پر چڑھتے وقت وہ حادثہ رونما ہو گیا جس کی مجھے امید نہ تھی۔

میں اپنی دھن میں مگن جا رہا تھا کہ اچانک ایک بچہ، میری موٹر سائیکل کے سامنے آ گیا۔ میں نے فُل بریک لگا کر موٹر سائیکل روک لی لیکن بچہ میری موٹر سائیکل سے ٹکرا چکا تھا۔

میں نے جلدی سے اُتر کر موٹر سائیکل کو سڑک کے کنارے کھڑا کیا اور لپک کر بچے کے قریب پہنچا۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا اور وہ نیچے گرا ہوا تھا۔ میں نے اپنی جیب سے رومال نکال کر اس کی پیشانی سے خون صاف کیا اور اس کی کمر میں ایک ہاتھ ڈال کر سہارا دے کر اسے کھڑا کیا۔ وہ کوئی بارہ تیرہ سال کا ہو گا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" بڑے آہستہ لہجے میں اس نے کہا۔

"آپ یہاں بیٹھ جائیں۔" میں نے اسے سہارا دے کر فٹ پاتھ کے کنارے بٹھا دیا۔

"اور کہیں تو چوٹ نہیں آئی آپ کے۔" میں نے اس کے سر پر رومال رکھتے ہوئے کہا۔

وہ ہولے سے مسکرایا اور گردن اٹھا کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا،

"ہمیں تو چوٹیں لگتی ہی رہتی ہیں۔"

اس کی یہ بات سن کر مجھے جیسے اک چوٹ سی لگی۔ شاید اس نے میرے تیز گاڑی چلانے پر طنز کیا تھا۔ میں نے تین چار بار اس کی پیشانی سے خون صاف کیا لیکن خون بند ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

"آیئے، اسکوٹر پر بیٹھیں، کسی قریبی کلینک چلتے ہیں۔" میں نے اس کا بازو پکڑ کر کہا۔

"ارے......! میں بالکل ٹھیک ہوں، آپ پریشان نہ ہوں۔ بس ذرا اسکوٹر آہستہ چلایا کریں۔" اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن ایک دم سے اسے چکر آ گیا۔ میں نے جلدی سے اسے سنبھال لیا،

"بھئی منے میاں...... ہم بہت شرمندہ ہیں۔ آئندہ تیز موٹر سائیکل نہیں چلائیں گے۔" اس نے گردن اٹھا کر میری آنکھوں میں جھانکا پھر اپنے دوسرے ہاتھ سے میرا ہاتھ تھام کر بولا۔

"وعدہ کریں......!"

"وعدہ......" میں نے اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے دبا کر کہا۔

"اچھا بھئی...... آپ اپنے گھر کا پتا سمجھائیں تاکہ ہم آپ کو آپ کے گھر تک ڈراپ کر دیں۔"

میری یہ بات سن کر اس نے اپنا سر جھکا لیا اور آہستہ سے بولا۔

"گھر......! میرا کوئی گھر نہیں ہے۔"

"کیا آپ کے امی، ابو، بہن بھائی نہیں؟"

"ہیں......! لیکن وہ میرے نہیں، میرا گھر...... گھر بھی میرا نہیں...... وہ سب لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں، کوئی مجھ سے محبت نہیں کرتا۔"

"اپنے دونوں ہاتھوں کو منہ پر ڈھانپ کر وہ رو پڑا۔ اسے اس طرح روتا دیکھ کر میرے دل پر جیسے چوٹ سی لگی۔ میں نے اپنی ہتھیلیوں سے اس کے گالوں پر آئے ہوئے آنسو پونچھ ڈالے۔

"آپ نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔" میں نے بچے کی اُداسی دور کرنے کے لئے بات گھما دی۔

"فرحان۔"

"پڑھتے ہیں؟"

"جی...... میں ساتویں میں ہوں۔"

"گڈ......!"

ابھی ہم آپس میں باتیں ہی کر رہے تھے کہ اچانک سامنے بیکری کی دُکان پر شور و غُل ہونے لگا۔ کچھ لوگ ہاتھوں میں ڈنڈے اٹھائے ہوئے، بڑے غصے کے عالم میں بیکری والے کو مارنے جا رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ خون خرابہ ہوتا، میں لپک کر دُکان کے اندر پہنچا اور میں نے ڈنڈے اٹھائے ہوئے لوگوں کو سمجھایا کہ لڑ جھگڑ کر مسئلہ حل نہ کریں۔ آپس میں بات چیت کے ذریعے مسئلے کو حل کریں۔ میرے سمجھانے بجُھانے پر وہ رک گئے۔ میں نے مسئلہ پوچھا تو پتا چلا کہ بیکری والے نے ایک بچے کو باسی ڈبل روٹی تازہ بتا کر دے دی اور جب اس کے باپ نے آکر شکایت کی تو اس سے لڑنے مرنے پر تیار ہو گیا۔

میں نے بیکری والے سے کہا، "بڑے افسوس کی بات ہے۔ آپ باسی چیزوں کو تازہ بتا کر بیچتے ہیں۔ اپنے ہی وطن کے لوگوں کا نقصان کرتے ہیں، انہیں بیمار کرتے ہیں۔" بیکری والا بہت سہما ہوا تھا۔ اس نے معافی مانگی اور آئندہ کے لئے توبہ کی۔

میں نے آنے والوں کو بھی سمجھایا کہ ذرا ذرا سی بات پر ڈنڈے نہیں نکالنا چاہیۓ۔ کوئی بھی مسئلہ ہو تو اسے مل بیٹھ کر بات چیت کے ذریعے حل کرنا چاہیۓ۔ پیار و محبت سے ہی مسائل حل ہوتے ہیں، جبر و تشدد سے کسی بھی مسئلے کو حل نہیں کیا جا سکتا۔

میرے سمجھانے بجُھانے پر مسئلہ حل ہو گیا۔ جب میں بچے کے پاس لوٹ کر آیا تو وہ بڑی حیرانی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"آپ نے لڑائی رُکوا دی؟"

"ہاں بھئی...! لڑنا تو بڑی بات ہے ناں.....
"آپ نے خواہ مخواہ لڑائی رُکوائی۔ لڑنے دیا ہوتا انہیں۔ بہت مزہ آتا جب ڈنڈے چلتے۔"

"نہ نہ بھائی...... یہ تو بہت بڑی بات ہے۔ آپ کو اس طرح نہیں سوچنا چاہئے۔ یہ وطن آپ کا ہے۔ اس میں رہنے والے سب لوگ آپ کے ہیں۔ اگر ہم سب لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپس میں روز اسی طرح لڑتے رہیں گے تو ایک دن پاکستان کمزور ہوجائے گا۔" میں نے بچے کو بڑے پیار سے سمجھایا۔

اس نے شرمندگی سے سر جھکالیا اور بولا۔
"مجھے معاف کر دیجئے گا۔ مجھے اس طرح نہیں سوچنا چاہئے تھا۔"

"چلیں...... آپ کو اس بات کا احساس تو ہوا۔" میں نے بچے کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

میں فرحان کے گھر گیا۔ اس کے امی ابو سے ملا۔ فرحان کے امی ابو نے بتایا کہ فرحان بے حد ضدی ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر روٹھ جاتا ہے۔ کسی سے سیدھی طرح بات نہیں کرتا۔ ہر کسی پر طنز کرتا رہتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض ہوجاتا ہے اس لئے سب لوگ اس سے نالاں ہیں۔ پھر میں نے ان کے والدین سے درخواست کی کہ وہ فرحان پر توجہ دیں کیونکہ وہ بے حد حساس بچہ ہے۔ اور پھر میں نے فرحان کو بھی بڑے پیار سے سمجھایا۔ اس کو بھی اس کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا۔

وہ سر جھکائے بڑے غور سے میری باتیں سُنتا رہا۔ پھر وہ اُٹھا اور اس نے اپنے امی ابو سے اپنے گزشتہ رویئے کی معافی مانگ لی۔ اس کے امی ابو نے اسے سینے سے لگالیا۔

جب میں چلنے لگا تو فرحان میرے پاس آیا اور بڑی محبت سے میرا ہاتھ تھام کر بولا۔
"بھائی جان ...... اب میں بہت اچھا بچّہ بن کر دکھاؤں گا۔" ایک لمحے کو وہ رُکا پھر دوسرے ہی لمحے بولا۔
"بھائی جان ...... میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں، آپ نے مجھے میرا اپنا گھر دلا دیا ہے۔"

اپنی موٹر سائیکل پر جب میں واپس آرہا تھا تو میری روح ایک اچھا کام کرنے پر بے حد خوش تھی لیکن میرا دل بہت اُداس تھا کیونکہ مجھے بڑی شدّت کے ساتھ اپنے ماں باپ اور بہن بھائی یاد آرہے تھے جو اب اس دنیا میں نہیں۔ جن دنوں پاکستان بننے کی تحریک زوروں پر تھی تو وہ پاکستان کی آزادی پر قربان ہوگئے تھے۔ انہیں ہندوؤں نے شہید کر دیا تھا۔

مجھے بڑی شدت کے ساتھ اپنے اکیلے پن کا احساس ہوا لیکن میں اکیلا نہیں تھا، میرے بہن بھائیوں اور ماں باپ نے اپنی جانوں کی قربانی دے کر مجھے ایک گھر عطا کیا تھا۔ میرا اپنا گھر، "روشن اور پیارا پاکستان !!!"

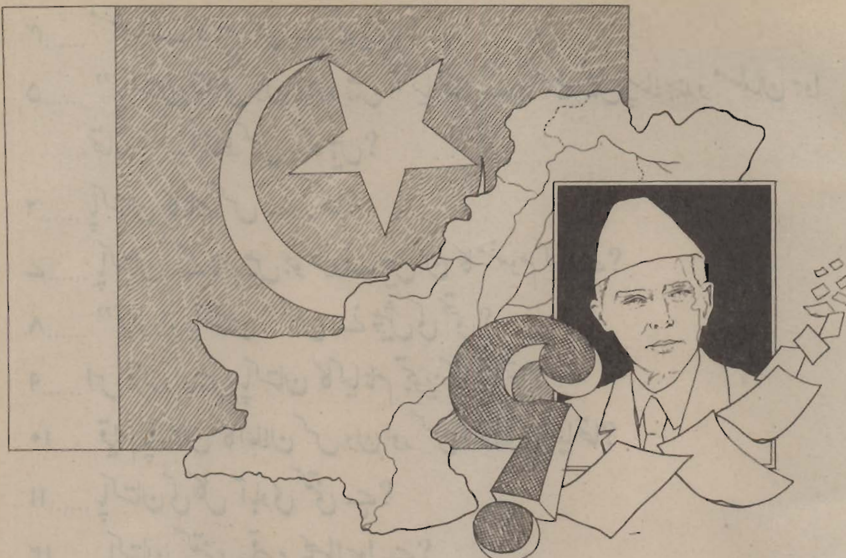

ادارہ

پاکستان کوئز

جشن آزادی کے حوالے سے درج ذیل سوالوں کے صحیح جوابات بھیجنے والے تین ساتھیوں کو انعام میں گھڑیاں اور کیلیکولیٹر دیئے جائیں گے۔ جوابات وصول ہونے کی آخری تاریخ ۱۲ ستمبر ہے۔ تین سے زائد صحیح جوابات پر فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی کیا جائے گا۔

۱..... "دو قومی نظریہ" کیا ہے؟

۲..... "دو قومی نظریہ" کا تصور کس نے اور کب پیش کیا تھا؟

۳..... مسلم لیگ کب وجود میں آئی؟

۴...... مسلم لیگ کا نام کس نے تجویز کیا؟

۵...... "پاکستان تو اسی دن وجود میں آگیا تھا جب برصغیر میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔" یہ الفاظ کس کے ہیں؟

۶...... پاکستان کا نام کس نے رکھا؟

۷...... پاکستان کے نام میں جو حروف ہیں ان کا مفہوم کیا ہے؟

۸...... "قرار داد پاکستان" کس نے پیش کی تھی؟

۹...... اس قرار داد میں پاکستان کا کیا نام تجویز کیا گیا تھا؟

۱۰...... قیام پاکستان کا اعلان کس دن اور کس وقت کیا گیا تھا؟

۱۱...... پاکستان کی کل آبادی کتنی ہے؟

۱۲...... پاکستان کتنے رقبے پر پھیلا ہوا ہے؟

۱۳...... پاکستان کا جغرافیائی محل وقوع کیا ہے؟

۱۴...... پاکستان میں اب تک کل کتنے گورنر جنرل، صدر اور وزیر اعظم گزرے ہیں؟ ان کے نام بھی بتائیے۔

۱۵...... پاکستان میں تعلیم کا تناسب کتنا ہے؟

۱۶...... پاکستان کے عام آدمی کی اوسط آمدنی کتنی ہے؟

۱۷...... پاکستان میں کل کتنی جامعات ہیں؟

۱۸...... پاکستان میں کتنے دریا بہتے ہیں؟

۱۹...... پاکستان کن کن اہم عالمی اداروں کا رکن ہے؟

۲۰...... پاکستان میں اب تک کتنے دستور بن چکے ہیں؟

کرنا ہمارا مسئلہ کشمیر پر ایک سروے

نائلہ صدیقی

آنکھ مچولی کے "کشمیر نمبر" کی آمد آمد تھی اور ہم اس سلسلے میں کچھ لکھنے کے لئے کوشاں تھے، پہلے تو سوچا کہ اخبار کے مطالعے اور تخیل کی بلند پروازی کا سہارا لے کر کوئی کہانی تخلیق کی جائے لیکن کافی دیر کی کوشش کے بعد معلوم ہوا کہ یہ ہمارے بس کی بات نہیں، پھر کیا کیا جائے؟ ہم سوچ میں پڑ گئے، اچانک ہمارے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا کہ کیوں نہ ہم اپنے آس پاس رہنے والے عام لوگوں سے اس موضوع پر بات کریں، ان کی رائے معلوم کریں اور پھر ان کے خیالات و آرا کو مضمون کا روپ دے لیں، چنانچہ اس مقصد کے لئے ہم نے اپنی دوست کا تعاون حاصل کیا اور اس مہم پر نکل

کھڑے ہوئے۔ "اس مہم کی ابتدا کسی بزرگ آدمی کی رائے سے ہونا چاہئے" ہماری دوست نے گویا فرمائش کی "تو چلو قریشی صاحب کے گھر چلتے ہیں، وہی اس محلے کے بزرگ ترین فرد ہیں، اگرچہ وہ یہ بات تسلیم نہیں کرتے" قریشی صاحب کے یہاں پہنچے تو وہ گویا اس موضوع پر بولنے کے لئے تلے بیٹھے تھے، کشمیر کا نام سنتے ہی بولنا شروع ہو گئے "ارے بھئی جہاد کرنا نوجوانوں کا کام ہے اور ہمارے ملک کے بیٹے اتنے بزدل نہیں...... (جتنے آپ کے، ہم نے دل میں کہا کیونکہ اس وقت ان کا بیٹا انڈین فلم دیکھنے میں بری طرح مگن تھا) "ہمارے ملک کے نوجوانوں کو چاہئے کہ وہ کشمیری بھائیوں کی پکار پر لبیک کہیں اور میدان عمل میں کود پڑیں" آپ کے صاحبزادے کب کود رہے ہیں اس میدان عمل میں؟" ہم نے سادگی سے پوچھا۔ "دیکھئے ناں، بات دراصل یہ ہے کہ میرا تو اکلوتا بیٹا ہے۔ میرا سرمایہ حیات، کل متاع، اگر اسے کچھ ہو گیا تو میرا کیا بنے گا؟" انہوں نے درد بھری آواز میں کہا۔ انہیں "کچھ" ہو چکا ہے، شاید آپ نے غور نہیں کیا۔ ہم نے ان کے لخت جگر کو دیکھتے ہوئے کہا جو ایک المیہ سین پر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ جن کے چار پانچ بیٹے ہوں وہ یہ قدم اٹھائیں اور جہاد میں حصہ لیں (چونکہ قدرت ناانصافی نہیں کرتی لہٰذا خود پانچ بیٹوں کے برابر ایک بیٹا ملا تھا مگر وہ اس نکتے پر غور نہیں کر رہے تھے) "جناب! بات بیٹوں کی تعداد کی نہیں، جذبے کی ہے، اگر جذبہ سچا ہو تو آدمی اپنی عزیز ترین شے بھی داؤ پر لگا سکتا ہے۔" ہم نے کہا مگر یہ کہنا تھا کہ بزرگ یکلخت بھڑک اٹھے "آپ لوگ سروے کرنے آئے ہیں یا میرے بیٹے کو میدان جنگ میں گھسیٹنے کے لئے؟ آخر اس معصوم نے آپ کا کیا بگاڑا ہے جو اس کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔"

"اس معصوم کو میدان جنگ میں گھسیٹنے کے لئے بھی کرین کی ضرورت ہے، جس کا انتظام ہم نہیں کر سکتے، ہاں اگر کشمیری مجاہدین چاہیں تو انہیں کسی توپ گاڑی پر بیٹھا کر لے جا سکتے ہیں بشرطیکہ یہ وہاں بھی اسی طرح نہ ہنستا رہا۔"

ہم نے مسلسل قہقہے لگاتے بیٹے کو دیکھ کر سوچا اور ان کے گھر سے باہر نکل آئے۔ "اب کہاں چلیں؟" ہم سوالیہ انداز میں دوست سے مخاطب ہوئے۔ "خاتون خانہ سے بھی ان کے تاثرات معلوم کرنے چاہییں کہ وہ اس مسئلے پر کس طرح سوچتی ہیں"؟ اس نے رائے دی۔ "ہاں یہ ٹھیک ہے۔" ہم نے اس کی رائے سے اتفاق کیا اور ایک خاتون خانہ کے گھر میں جا گھسے اور داخل ہوتے ہی پچھتانے لگے کیونکہ اچانک ہم پر یلغار ہوئی اور موصوفہ کے پانچوں بچے کسی نامعلوم مقام سے نکل کر ہمارے اوپر چڑھ دوڑے۔ دوسری طرف خاتون اپنے پانچوں بچوں کی جغرافیائی صورتحال اور تاریخی کارناموں پر روشنی ڈالنے لگیں، بڑی مشکل سے انہیں کشمیر کے موضوع کی طرف متوجہ کیا۔ "جہاد کشمیر" وہ ایک لمحے کے

لئے سوچ میں پڑ گئیں "ارے بھئی میں اس بارے میں کیا سوچوں گی؟ مجھے تو اپنی دال روٹی کی فکر مارے ڈال رہی ہے (ان کے بچے پیچھے سے ہمیں جو مارے ڈال رہے تھے اس کی انہیں کوئی فکر نہیں تھی) اب دیکھیں ناں بجٹ میں!............ چونکہ ہر شریف آدمی کی طرح ہمیں بھی بجٹ سے نفرت ہے لہٰذا ہم نے ان کا جملہ کاٹتے ہوئے کہا "اس وقت بجٹ کی نہیں کشمیر کی بات ہو رہی ہے۔ "یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ جب ہمیں سکون سے کچھ کھانے کو ملے گا تبھی تو اس بارے میں سوچیں گے ورنہ تو اپنی ہی فکروں میں پڑے رہیں گے اور مہنگائی کی تو مت پوچھیں۔"

"تو ہم کب پوچھ رہے ہیں؟"

دوست نے اچانک بھڑک کر کہا۔

"تو کیوں نہیں پوچھتیں، پوچھئے ناں غریب عوام کی مشکلات،" وہ بھی تلملا گئیں۔

"معلوم ہیں وہ تمام مشکلات، کیونکہ وہ غریب عوام ہم ہی ہیں۔" ہم نے بیزاری سے کہا۔

"آپ صرف یہ بتایئے کہ آپ کشمیر کے سلسلے میں کیا کر سکتی ہیں"؟

دوست نے سنبھلے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"میں"؟ وہ سوچنے لگیں۔ "ہاں جب میرے بچے بڑے ہوں گے تو میں انہیں محاذ پر بھیج دوں گی بلا خوف و خطر" انہوں نے فخر سے کہا۔

"خوف تو وہاں پھیلے گا جہاں یہ پہنچیں گے۔" ہم نے سوچا۔ "لیکن محترمہ! انڈین آرمی آپ کے بچوں کے بڑا ہونے کا خطرہ نہیں مول سکتی اور نہ ہی کشمیری مجاہدین ان کے انتظار میں جہاد روک سکتے ہیں، ویسے بھی جتنی خطرناک صلاحیتیں اس وقت ان میں موجود ہیں، وہ بڑے ہونے پر کہاں رہ سکیں گی؟ ہماری دوست نے ایک بچے کو اپنے اوپر سے جھٹکتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی ہم دونوں نے باہر کی راہ لی۔ "آخر یہ لوگ اس مسئلے پر سنجیدگی سے کیوں نہیں سوچتے؟" ہم نے دل برداشتہ ہوتے ہوئے کہا۔ "بھئی یہ عام لوگ ہیں اس لئے اتنا نہیں سوچتے، آؤ نسیم صاحب کے گھر چلیں، وہ تو ادیب ہیں اس مسئلے پر یقیناً ان کا کوئی واضح نقطہ نظر ہوگا۔" اس نے ہمیں تسلی دی۔ "وہ خود تو واضح ہیں نہیں نقطہ نظر کیا واضح ہوگا؟ نمبر دو انہیں ادیب۔ کہہ کر تم ایک بھیانک غلطی کر رہی ہو کیونکہ ان کی تمام تخلیقی صلاحیتوں کا نچوڑ تین کہانیوں کی صورت میں نکلا ہے جو کہ "ننھے ادیبوں" کے حصے میں شائع ہوئی تھیں اور بعد میں ان پر نقل شدہ ہونے کا الزام بھی لگا تھا اور یہی تین کہانیاں ان کی دس سالہ تصنیفی زندگی کا حاصل ہیں۔" ہم نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ "ادیب، تو ادیب ہوتا ہے، اس کے سوچنے سمجھنے کا اپنا انداز ہوتا ہے، خواہ اس کی تین تحریریں چھپی ہوں یا تمیں۔" ہماری دوست برا مان گئی تو ہم اس کے موڈ

کی بحالی کے لئے ادیب صاحب کے گھر کی طرف چل پڑے۔ موصوف نے کشمیر کا نام سنتے ہی ایک آہ بھری اور غمناک آواز میں بولے "جہاد کشمیر! مت پوچھئے، جب میں اخبارات میں اس کے بارے میں پڑھتا ہوں تو مجھ پر کیا گزرتی ہے؟ میرا تو جی چاہتا ہے کہ خود محاذ پر پہنچ جاؤں اور تمام انڈین آرمی کو تہہ تیغ کر ڈالوں مگر افسوس یہ میرے بس میں نہیں، ہاں البتہ میں اپنے قلم کے ذریعے ضرور جہاد کر رہا ہوں، یہ دیکھئے میں نے کل ہی اس موضوع پر ایک کہانی لکھی ہے ملاحظہ فرمایئے! انہوں نے چالیس صفحات ہماری طرف بڑھائے۔

"یہ ایک کہانی ہے؟ ہم نے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

"جی ہاں! ایک کی کیا بات ہے؟ میں ایسی سو کہانیاں لکھ سکتا ہوں۔" انہوں پر غرور انداز میں کہا۔

"مگر لکھئے گا مت!" ہم نے آہستہ سے کہا۔

کیونکہ ان کی کہانی کے پہلے ہی صفحے پر اتنے آدمی مرے تھے جتنے پورے کشمیر تو کیا دوسری جنگ عظیم میں بھی ہلاک نہ ہوئے ہوں گے۔ دوسرے صفحے سے انہوں نے بھارتی افواج کا قلع قمع کرنا شروع کیا تو پستول سے لے کر ٹینک اور گولہ بارود سب استعمال کر ڈالا، حالانکہ ہمارے خیال میں یہ سارا گولہ بارود اس کہانی کے مصنف پر استعمال ہونا چاہئے تھا، کہانی کا ہیرو بھارتی فوجیوں کو مارتا گیا اور وہ مرتے گئے، آخر میں کشمیر کو آزاد ہوتے اور سورج کو مسکراتے ہوئے دکھایا گیا مگر روتے ہوئے قارئین کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا۔ آخر میں یہ انکشاف پڑھ کر ہمارے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ کہانی کے ہیرو وہ بذات خود تھے۔ یہ پڑھتے ہی ہم نے کہانی ان کی میز پر پٹخ دی "نسیم صاحب! ایک ادیب اس سلسلے میں بہت کچھ کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ حقیقت پسند ہو، کلاشن کوف اٹھا کر کشتوں کے پشتے لگانے کے بجائے اس مسئلے کی گہرائی پر غور کرے اور کوئی قابل عمل تجویز یا لائحہ عمل پیش کرے یا کم از کم اپنی تحریر کے ذریعے عام آدمی کو اس مسئلے سے آگاہ کرے اور اس بارے میں سوچنے کا شعور پیدا کرے، یہی ایک ادیب کا سب سے بڑا کارنامہ ہوتا ہے۔" ہم اپنی بات ختم کرتے ہی باہر کی طرف لپک گئے کیونکہ اب ہمارے اور نسیم صاحب کے تعلقات ہمیشہ کے لئے کشیدہ ہو چکے تھے۔ "ارے سنو! وہ تمہارے محلے میں سردار صاحب رہتے ہیں ناں فلاحی تنظیم کے چیئرمین، ان کے پاس چلتے ہیں۔ "ہم نے سوچتے ہوئے کہا۔" "ہنھ فلاحی تنظیم، ان کی پوری فلاحی تنظیم ان کے دو بیٹوں پر مشتمل ہے جن کی فلاح و بہبود کے لئے وہ دن رات محلے والوں کو لوٹتے رہتے تھے، ویسے اب انہوں نے گھر تبدیل کر لیا ہے کیونکہ ہمارے محلے والے مزید لٹنے کے لئے تیار نہ تھے۔" وہ کہتی چلی گئی۔ "چلو دیکھتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ محلہ تبدیل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی یہ

عادت بھی تبدیل ہو گئی ہو یعنی لوگوں کو لوٹنے والی، ویسے بھی ہمیں تو صرف ان کی رائے معلوم کرنا ہے۔ اچھا چلو۔ وہ راضی ہو گئی اور ہم نے سردار صاحب کے گھر کا راستہ پکڑا۔ سردار صاحب اپنی تنظیم کے دونوں ممبران کے ساتھ ایک ہنگامی اجلاس کرنے میں مصروف تھے کیونکہ اس اجلاس میں ان کے سات ننھے منے پوتے بھی شامل ہو گئے تھے لہٰذا اجلاس خود بخود ہنگامی ہو گیا تھا۔ بہر حال ہمیں دیکھتے ہی انہوں نے اجلاس برخاست کیا اور ہنگامے کے ذمہ دار شرپسند پوتوں کو رفع دفع کر کے ہماری طرف متوجہ ہوئے۔ "ارے آپ!" وہ ہماری دوست کو دیکھ کر چونکے "یقین کیجئے میں نے گھر تو بدل لیا ہے لیکن دن رات آپ کے محلے والوں کو یاد کرتا رہتا ہوں۔" انہوں نے درد مندی سے کہا۔ "محلے والے بھی آپ کو دن رات یاد کرتے رہتے ہیں برے الفاظ میں۔" دوست نے کسمساتے ہوئے کہا تو ہم جلدی سے اس کی بات کاٹ کر بول اٹھے "فی الحال ہم آپ سے کشمیر کے بارے میں کچھ بات کرنے آئے ہیں" "جی کشمیر؟" ان کا چہرہ فق ہو گیا۔

"وہ جی بات یہ ہے کہ آجکل ہماری تنظیم کی مالی حالت کچھ ایسی ہے کہ ہم چندہ دینے کے متحمل نہیں ہو سکتے" انہوں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن ہم چندہ لینے نہیں آئے اس لئے کہ آپ کی تنظیم کی بدحال معیشت سے ہمیں کوئی غرض نہیں، ہمیں تو صرف یہ پوچھنا ہے کہ جہاد کشمیر کے سلسلے میں آپ کیا کر رہے ہیں؟ کیونکہ آپ ایک فلاحی تنظیم کے چیئرمین ہیں۔ اگرچہ اس تنظیم کی فلاح اسی میں ہے کہ اسے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔" دوست نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ مگر سردار صاحب کے کانوں میں کوئی ٹیکنیکل خرابی تھی جس کی وجہ سے ان پر ایسی باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا "ارے میں نے اس سلسلے میں کیا نہیں کرنے کی کوشش کی؟ مگر ہماری قوم چہ چہ، اس میں ایثار و قربانی، دوسروں کے لئے کچھ کر گزرنے کا جذبہ تو رہا ہی نہیں۔ میں نے مسلسل چھ ماہ کشمیر کے لئے چندے کی مہم چلائی مگر بے سود، پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے ہماری قوم کو؟" وہ حیرانگی سے بولے۔ "سردار صاحب! چندہ جمع اور خرچ کرنے کے علاوہ بھی آپ بہت کچھ کر سکتے ہیں مثلاً لوگوں کو انڈین فلموں اور دیگر مصنوعات کا بائیکاٹ کرنے کی ترغیب دیتے، انہیں اس مسئلے کی سنگینی سے آگاہ کرتے اور...... ہمارا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ سردار صاحب اچانک بھڑک کر بول اٹھے تھے "ارے جانے دیجئے، یہ سب کہنے کی باتیں ہیں، کون سالوگ ہماری باتیں سن کر انڈین فلمیں دیکھنا چھوڑ دیں گے، ہماری کون سنتا ہے جی؟" "آپ کی کوئی اس لئے نہیں سنتا سردار صاحب! کہ آپ اپنا اعتماد کھو چکے ہیں، آپ کے قول و فعل میں تضاد ہے، اس لئے کوئی آپ کی باتوں کا اثر نہیں لیتا۔" ہماری دوست جو پہلے ہی بھری بیٹھی تھی ایک دم برس پڑی۔ "اچھا جناب! میرے قول و فعل میں تضاد ہے تو آپ فرمائیے، آپ خود کیا کر رہی ہیں اس سلسلے میں، اس

مسئلے کو حل کرنے کے لئے؟ یہ زبانی جمع خرچ کس کام کا، یہ گھر گھر پھر کر سروے کرنے سے کیا فائدہ ہو رہا ہے کشمیری مجاہدین کو، ہیں جی؟" سردار صاحب پھٹ پڑے، ان کی باتیں سن کر ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے کیونکہ ہمارے پاس ان کی باتوں کا کوئی جواب نہ تھا، اس بات کا جواب تو صرف وہ پاکستانی بھائی دے سکتے ہیں جو میدان جنگ میں عملی طور پر کود چکے ہیں اور اپنے کشمیری بھائیوں کے شانہ بشانہ آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں یا پھر وہ پاکستانی جو دامے درمے قدمے سخنے اس جہاد میں شریک ہیں اور کشمیر جنت نظیر کی آزادی کے لئے دعا گو ہیں۔

شاہین بچہ

منیر احمد راشد

باغ میں خوب رونق تھی۔

صبح کا وقت تھا اور بہار کا موسم۔ ہر طرف رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے ساری زمین کو سبزے نے ڈھک دیا تھا۔ اور اس سبزے میں سے گزرنے والی پانی کی چھوٹی چھوٹی نہروں میں بہتا ہوا شفاف پانی چاندی کی طرح چمک رہا تھا، یوں لگتا تھا جیسے زمین نے سفید کناری والا سبز دوپٹہ اوڑھ لیا ہو، جس پر سرخ، نیلے، پیلے، گلابی پھول کڑھے ہوئے تھے۔

سورج ابھی نکلا نہیں تھا، البتہ سپیدۂ سحر نمودار

بخش دی تھی۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا بھی خراماں خراماں گنگناتی ہوئی۔ اِدھر سے اُدھر اٹکھیلیاں کرتی پھر رہی تھی۔ لیکن وہ دونوں اس ماحول سے بالکل الگ تھلگ تھے۔

ایک اس باغ کا راجہ گدھ، اور دوسرا شاہین بچہ۔ راجہ گدھ تو رات کو دیر تک مُردار کھانے کی وجہ سے مست پڑا سو رہا تھا اور ویسے بھی وہ دن چڑھے اٹھنے کا عادی تھا، البتہ شاہین بچہ اداس تھا۔ اور اس کا دکھ اتنا شدید تھا کہ باغ کا اتنا اچھا ماحول اور صبح کا خوبصورت منظر بھی اس کے غم کو ہلکا نہیں کر سکا تھا۔

شاہین بچے کی اس اداسی کا سبب کیا تھا؟ اس کا اسے خود بھی پتا نہیں تھا، اور وہ سنبل کے اونچے درخت کی سب سے اونچی شاخ پر بنے ہوئے اپنے گھونسلے میں بیٹھا اپنی اس نامعلوم اداسی اور مایوسی کی وجہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا ذہن پریشان تھا اور کوئی بات بھی اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ہوسکتا ہے اس کی موجودہ اداسی کا سبب چیل سے ہونے والی کل کی جھڑپ ہو، جس میں اس کا دایاں بازو زخمی ہوگیا تھا۔ "لیکن نہیں۔" اس نے سوچا۔ "میں چیل سے چھوٹا ضرور ہوں مگر کمزور نہیں ہوں .... میں اسے ضرور مزا چکھا دیتا مگر باغ کے سارے پرندے اس کے حمایتی بن گئے تھے، حتیٰ کہ مور بھی جو اس کا بہت اچھا دوست

شاہین بچے نے جب سے ہوش سنبھالا تھا خود کو اسی باغ میں پایا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا اصل گھر کہاں ہے؟ وہ بہت چھوٹا سا تھا جب نہ جانے کس طرح اس باغ میں آگیا تھا۔ پہلے پہل تو باغ کے پرندے اس سے دور دور رہے لیکن جب اس نے یہاں مستقل رہنا شروع کردیا تو وہ بھی اس کے عادی ہوگئے۔ اس کی سب سے گہری دوستی مور سے تھی جو نہ صرف بہت بڑے جسم کا مالک تھا بلکہ بہت خوب صورت بھی تھا۔ اس کی آواز اچھی تھی اور اس کے ناچ کا تو جواب ہی نہیں تھا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مور کا گھر بھی سنبل کے قریب تھا۔ دونوں کی دوستی بہت گہری ہوگئی تھی۔ شاہین بچہ کی پڑوسن ایک مکار چیل تھی۔ سنبل کے ساتھ والے شیشم کے درخت پر اس کا گھونسلہ تھا۔ چیل اور راجہ گدھ، شاہین بچے اور مور کی دوستی سے خوش نہیں تھے۔ چیل وقتاً فوقتاً شاہین بچے کو تنگ کرتی رہتی تھی۔ کبھی اس کے گھونسلے سے تنکے اٹھا کر اپنے گھونسلے میں رکھ لیتی تھی، کبھی اس کا بچا ہوا شکار اٹھا کر لے جاتی۔ شاہین بچے کو کہیں سے ایک خوبصورت ریشمی کپڑا مل گیا تھا جسے وہ اپنے گھونسلے کو سجانے کے لئے اٹھا لایا تھا مگر کم بخت چیل کی نظر بھی اس کپڑے پر پڑ گئی تھی اور ایک دن چوری چھپے وہ اس کپڑے کو اٹھا کر لے گئی۔ شاہین بچے کو

جب معلوم ہوا تو اسے بہت غصہ آیا۔ وہ لال پیلا ہوتا ہوا چیل کے گھونسلے میں جا گھسا اور اپنا کپڑا اٹھانا چاہا۔ چیل بھی گھونسلے میں موجود تھی، شاید اسے یقین تھا کہ شاہین بچہ اپنا حق واپس لینے ضرور آئے گا، اس لئے وہ پہلے سے مقابلے کے لئے تیار تھی مگر شاہین بچہ تو اس وقت آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی تیز چونچ، مضبوط پروں اور نوکیلے پنجوں سے چیل کی وہ دھنائی کی کہ اسے نانی یاد آگئی لیکن تھی وہ بھی بہت ہی ڈھیٹ .... اس نے ریشمی کپڑے کو اپنی چونچ میں دبا لیا اور یوں کھینچا تانی میں کپڑے کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ شاہین بچہ اپنے کپڑے کا دوسرا آدھا حصہ بھی حاصل کر لیتا مگر عین وقت پر راجہ گدھ اور اس کی کابینہ کی مداخلت کی وجہ سے وہ اپنے مشن میں کامیاب نہ ہو سکا۔ راجہ گدھ کے اشارے پر کابینہ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ کپڑے کی ملکیت کا فیصلہ کابینہ کے اجلاس میں ہوگا کیوں کہ اس طرح کے لڑائی جھگڑے سے باغ کا امن خراب ہوتا ہے اور پرندوں کی جانوں کو بھی خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ شاہین بچہ بنیادی طور پر شریف اور اصول پسند تھا۔ وہ کابینہ کی یہ بات مان گیا۔ اجلاس ہوا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ شاہین بچے کا کپڑا واپس کر دیا جائے مگر چیل نے اس فیصلے کو نہیں مانا۔ اور آج چالیس پینتالیس دن گزرنے کے بعد بھی شاہین بچے کو اپنا حق نہیں ملا تھا۔ اس نے کابینہ سے بھی درخواست کی تھی کہ وہ اپنے فیصلے پر عمل درآمد کرانے کے لئے چیل کو مجبور کرے مگر اس کی بات سنی نہیں گئی تھی۔ آخر خود اس نے چیل سے کپڑا مانگا تو چیل نے اس پر حملہ کر دیا اور اس کا بازو زخمی کر دیا۔

چیل سے تو خیر وہ نپٹ لیتا مگر اسے راجہ گدھ کا خوف تھا۔ جو بات بے بات پہلے ہی اس کے خلاف کارروائیاں کرتا رہتا تھا۔ الو راجہ گدھ کا منظورِ نظر تھا۔ باغ کے اکثر پرندے ان دونوں کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن دونوں سے ڈرتے تھے۔ شاہین بچے کی اس سے کئی بار تو تو میں میں ہو چکی تھی شاہین بچے نے اسے گدھ کی ناجائز اولاد کا خطاب دے دیا تھا اور ایک بار تو جب الو نے اپنے پڑوسی اور شاہین بچے کے ہم نسل، شکرے کے گھر پر حملہ کیا تو شاہین بچہ شکرے کی مدد کے لئے پہنچ گیا تھا مگر وہی راجہ گدھ، چیل، کوئے، اور ان کی برادری کے لوگوں نے الو کی مدد کی اور اسے کچھ کہنے کے بجائے الٹا شکرے کو ڈانٹا اور خوب آنکھیں دکھائیں۔ شکرا اس وقت تو خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا مگر بعد میں اس نے اپنے گھر کو بھی خوب مضبوط بنایا اور خود بھی خوب کھا پی کر طاقت حاصل کی۔ وہ دراصل الو کو اس کی حرکتوں کا مزہ چکھانا چاہتا تھا۔ الو اس سے خوفزدہ رہتا تھا اور مسلسل راجہ گدھ کو اکساتا رہتا تھا کہ وہ شکرے کے خلاف کچھ کارروائی کرے۔ راجہ گدھ خود شکرے سے خوف محسوس کرنے لگا تھا اور کسی موقع کی تلاش میں تھا۔ پھر ایک دن شکرے کی بے وقوفی کی وجہ سے وہ موقع راجہ

گدھ کے ہاتھ آگیا جس کا اسے انتظار تھا۔ اس نے خوب زور زور سے چیخ کر باغ کے سارے پرندوں کو اپنے ساتھ ملایا اور شکرے پر حملہ کر دیا۔ اور اس کی ایسی پٹائی کی کہ بس ادھ مواکر کے چھوڑا۔ اس کا گھر تباہ کر دیا۔ مار مار کر اس کا سارا جسم زخمی کر دیا۔ سارے بال اور پر نوچ کر پھینک دیئے۔ اب شکرا ایک بوٹی کی صورت میں اپنے ٹوٹے پھوٹے گھونسلے میں پڑا اپنی حماقت اور بے بسی پر آنسو بہا رہا تھا۔ شاہین بچہ اپنی کوشش کے باوجود اس کی کچھ مدد نہیں کر سکا تھا۔

الو اور راجہ گدھ کی حرکتوں سے سارا باغ تنگ تھا۔ کچھ عرصے پہلے تک پھر بھی حالات اچھے تھے، جب ایک دوسرا گدھ اس باغ میں آگیا تھا۔ اس نے راجہ گدھ کو کئی بار للکارا اور ایک دو جھڑپوں میں اس کی پٹائی بھی کی۔ باغ کے بہت سے پرندے بھی اس کے حامی ہو گئے تھے۔ لیکن کچھ راجہ گدھ کی چالاکی اور کچھ اپنی بیماری کے سبب دوسرا گدھ جلد ہی مر گیا تھا اور آج کل راجہ گدھ کو کھل کھیلنے کا موقعہ ملا ہوا تھا۔ شکرے کو مارنے کے بعد راجہ گدھ شاہین کے بچے کو گھیرنے کی کوشش کر رہا تھا اور شاہین بچہ پریشان تھا کہ وہ کیا کرے؟ یہ بات نہیں کہ وہ راجہ گدھ سے ڈرتا تھا، بلکہ اسے اصل خوف اس بات کا تھا کہ اگر اس نے کسی کے خلاف لڑائی کی تو اسے باغ سے نکال دیا جائے گا اور باغ سے نکلنے کا تصور ہی اس کے لئے جان لیوا تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ وہ باغ کی حسین فضا، کوئل، بلبل اور دوسرے خوش آواز پرندوں کے گانے، مور کے رقص اور پھولوں کی خوش بو کے بغیر جیسے مر جائے گا۔ کبھی کبھی تو اسے یہ ساری چیزیں ہیچ نظر آنے لگتیں اور وہ سوچتا کہ ان سب کو چھوڑ کر دور فضاؤں میں نکل جائے۔ آسمان کی بے کراں وسعتوں میں چکر لگائے۔ دنیا کے دوسرے باغوں، پہاڑوں اور سبزہ زاروں کی سیر کرے مگر پھر اپنے اندر ہمت کی کمی پاتے ہوئے وہ اسی باغ میں رہنے کو ترجیح دیتا۔ باغ سے اپنی اس محبت کا ذکر وہ سر عام کرتا رہتا تھا، یہی وجہ تھی کہ راجہ گدھ اور اس کی کابینہ شاہین بچے کی اس کمزوری کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ وہ ذرا ذرا سی بات پر اسے باغ سے نکال دینے کی دھمکی دیتے۔ اور شاہین بچہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کی ہر جائز ناجائز بات کو مانتا چلا جاتا۔

مگر کل کی لڑائی کے بعد اس کا دل بہت اداس ہو گیا تھا۔ اسے اپنی تنہائی اور بے بسی کا احساس کانٹے کی مانند چبھ رہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ آخر یہ بے عزتی اور بے غیرتی کی زندگی کب تک چلے گی؟............

انہیں سوچوں میں ڈوبا باغ کی رونق سے لاتعلق وہ اپنے گھونسلے میں بیٹھا تھا کہ اچانک اس نے محسوس کیا جیسے ہر طرف ایک دم سناٹا طاری ہو گیا ہو۔ چہکتے اور شور مچاتے پرندے بالکل خاموش ہو چکے تھے۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اور گردن کو گھما کر ادھر ادھر دیکھا تو باغ میں عجیب

منظر نظر آیا۔ بلبلیں، کوئلیں، فاختائیں، کبوتر سب اپنے اپنے گھونسلوں میں دبک گئے تھے اور لگتا تھا جیسے انہوں نے اپنی سانسیں روک لیں ہوں۔ مور، راج ہنس، چکور، بگلے سب پودوں کے جھنڈ میں جا چھپے تھے۔ راجہ گدھ جو ابھی ابھی بیدار ہوا تھا اور اپنے بدبو دار گڑھے میں سے نکل کر باغ کی سیر کو آیا ہی تھا، بڑی افراتفری میں واپس اپنے گھڑے کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ سب سے برا حال الو کا تھا۔ وہ جو ہر وقت اپنی بڑی بڑی خوں خوار آنکھیں ہر کسی کو دکھاتا رہتا تھا، آنکھیں بند کئے اپنے گھونسلے میں اوندھا پڑا تھا۔ صبح کی ہوا اب ذرا تھم تھم کر چل رہی تھی۔ درخت اور پھول ساکت ہو گئے تھے۔ لہراتا ہوا سبزہ اور مچلتا ہوا پانی بھی یوں لگتا تھا جیسے سو گیا ہو۔ شاہین بچہ اس حیرت انگیز تبدیلی پر بہت حیران تھا۔ اس کی زندگی میں یہ سب پہلی مرتبہ ہوا تھا۔ سبب جاننے کے لئے اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تو اسے اپنے سامنے والے سنبل پر ایک عظیم الشان شہباز بیٹھا نظر آیا۔ وہ گردن گھما گھما کر سارے باغ کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے بیٹھنے کے انداز سے وقار جھلکتا تھا۔ اس کے مضبوط پر، تیز اور نوکیلی چونچ، توانا پنجے اور سب سے بڑھ کر اس کی آنکھوں کی خوفناک چمک دیکھنے والوں پر فوراً رعب طاری کر دیتی تھی۔ پہلی نظر میں تو شاہین بچہ بھی ڈر گیا تھا۔ مگر پھر یہ سوچ کر اس کو حوصلہ ملا کہ یہ تو اپنی برادری اور اپنے ہی خاندان کا فرد ہے۔ اس سے بھلا کیا ڈرنا، ؟ بلکہ فوراً ہی اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ وہ راجہ گدھ اور اس کی کابینہ کے خلاف اپنے اس بزرگ سے شکایت کرے۔

یہ سوچ کر وہ اپنے گھونسلے سے اڑا اور عظیم شہباز کے پاس جا بیٹھا۔ شہباز نے اسے مسکرا کر دیکھا اور حال احوال پوچھے۔ ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد شاہین بچے نے اپنی تمام شکایات اس کے سامنے رکھیں اور درخواست کی کہ وہ راجہ گدھ کے خلاف اس کی مدد کرے۔ عظیم شہباز نے ایک بار پھر مسکرا کر شاہین بچے کی طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

"نوجوان کتنے افسوس اور دکھ کی بات ہے تم شاہین ہو کر ایسی مظلومانہ کیفیت کا شکار ہو۔ مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ کوے، چیلیں اور گدھ تمہیں مارتے ہیں۔ حتیٰ کہ الو بھی آنکھیں دکھاتا ہے۔ مجھ یہ سوچ سوچ کر بھی شرم آ رہی ہے کہ میری نسل کا نوجوان اتنے عرصے سے ایسی بڑی حالت میں کس طرح زندگی گزار رہا ہے؟ لیکن خیر اس میں تمہارا کیا قصور .... تم کو تو پتہ ہی نہیں ہے کہ تمہارے بڑے کس شان و شوکت کے مالک تھے؟ اور یہ چیل کوئے اور الو گدھ کس طرح ان سے خوف کھاتے تھے؟ اور کونے کھدروں میں چھپ کر زندگی گزارتے تھے .... نوجوان تمہاری ساری مصیبت کی صرف ایک وجہ ہے اور وہ یہ کہ تم نے اس باغ سے دل لگا لیا ہے۔ گل و بلبل اور نغمہ و سرور تمہاری نس نس میں سما گیا ہے۔ بے

کار اور بے مقصد زندگی نے تمہارے دل سے ولولوں اور حوصلوں کو چھین لیا ہے۔ تمہاری قوتِ بازو کو شل کر دیا ہے۔ تمہاری ہمتِ پرواز کو ختم کر دیا ہے۔ کنوئیں کے مینڈک کی طرح تم نے بھی اس باغ کو کُل کائنات سمجھ لیا ہے .... تم اپنی اصلیت بھول چکے ہو............ مجھے دیکھو میں بھی تو تمہارے جیسا ہوں .... مگر تم دیکھ رہے ہو کہ میرے آتے ہی سارے گدھ اور الو کیسے چھپ گئے ہیں .... اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں کسی باغ کا قیدی شاہین بچہ نہیں ہوں۔ میں آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرنے والا شہباز ہوں۔ چڑیا کی طرح گھونسلہ بنا کر نہیں رہتا۔ چٹانوں میں بسیرا کرتا ہوں، باغ اور گلشن کے ماحول میں مست نہیں ہوتا بلکہ درویشوں کی طرح ان حقیر چیزوں سے بے نیاز ہو کر بیابانوں میں رہتا ہوں۔ جہاں تک تم جیسے کمزور پرندوں کی سوچ بھی نہیں پہنچ سکتی، میرے مضبوط پر پلک جھپکتے میں مجھے وہاں پہنچا دیتے ہیں۔ ہزاروں فٹ کی بلندی سے زمین پر پڑے ہوئے دانے میری نظر میں آجاتے ہیں اگر غصے میں آکر شیر پر بھی حملہ کروں تو اسے منٹوں میں جان سے مار ڈالوں .... اس کی وجہ کیا ہے؟ .... بس یہی کہ میں گل و بلبل کا قیدی نہیں، آزاد منش درویش ہوں۔ تم بھی اگر اپنی فطری شان و شوکت چاہتے ہو تو اس بے عملی اور بے مقصدیت کو چھوڑو۔ کاہلی سے توبہ کرو اور جدوجہد اور محنت کا رستہ اختیار کرو۔ چھوٹی چھوٹی خواہشوں اور ننھے باغیچوں کو اپنا آئیڈیل مت بناؤ........... اونچی نظر رکھو، اونچی پرواز کرو۔ ستاروں سے آگے جہانوں کی تگ و دو کرو .... پھر یہ گدھ اور یہ الو تمہارے نام سے ہی کانپنے لگیں گے۔ تمہیں کپڑے کی ایک دھجی کے لئے یوں پریشان نہیں ہونا پڑے گا۔ اگر تم میری طرح شہباز بننا چاہتے ہو تو میرے پیچھے، میرے نقش قدم پر چلے آؤ۔" عظیم شہباز نے یہ کہا، اڑا اور آن کی آن میں آسمان کی بلندیوں پر پہنچ گیا۔

شاہین بچہ سوچتی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا دل تذبذب کا شکار تھا، ایک طرف باغ کی حسین زندگی تھی اور دوسری طرف مسلسل جدوجہد اور بیابان کی (اس کے خیال میں) خشک زندگی۔ لیکن اس پر ابھی تک چیل کے ہاتھوں اپنی توہین اور گدھ کی بے انصافی کا غم غالب تھا، پھر وہ اپنی آنکھوں سے اپنے بزرگ کی شان بھی دیکھ چکا تھا، اس کے باوجود کہ اسے فیصلہ کرنے میں دِقت ہو رہی تھی .... لیکن بالآخر اس نے ایک فیصلہ کیا........... شہباز بننے کا فیصلہ .... اس نے ایک پرجوش چیخ ماری اور پکار کر کہا "اے عظیم شہباز میں آرہا ہوں۔" باغ کے حسن کی طرف سے آنکھیں بند کیں، پروں کو تولا اور ایک نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ شہباز کے پیچھے فضا کی وسعتوں میں پرواز کر گیا۔

●●

انعامی لطیفہ

ننھا فیضان (اپنے دوست سے) "میرے پپا سڑک پار کرتے وقت بہت ڈرتے ہیں۔"
دوست ...... "اچھا۔ لیکن تمہیں کیسے معلوم؟"
ننھا فیضان ...... "سڑک پار کرتے وقت وہ میری انگلی پکڑ لیتے ہیں۔"
مرسلہ ...... ہما عثمان، مدینہ مارکیٹ نیو کراچی

ایک سوار گھوڑے سے گر گیا۔ ٹانگ ٹوٹ گئی۔ گھوڑے نے اسے منہ میں پکڑا اور ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ دوستوں نے کہا،
"یار......! تمہارا گھوڑا بہت عقلمند نکلا۔"
سوار نے جواب دیا، "خاک عقلمند نکلا، وہ کم بخت مجھے جانوروں کے ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔"
مرسلہ فیصل احمد شجراہ، کندھ کوٹ جیکب آباد

ایک دیہاتی کسی فیشن ایبل ہوٹل میں گیا اور چائے پینے کی خواہش ظاہر کی۔ ویٹر چائے کی چھوٹی سی پیالی میں چائے لے آیا جو دیہاتی نے ایک ہی گھونٹ میں ختم کر ڈالی اور ویٹر سے بولا،
"بھئی میٹھا ٹھیک ہے، چائے لے آؤ۔"
مرسلہ ...... جاوید احمد پرنم، ڈھانڈلہ داجل

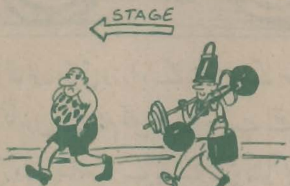

۱۹۷۸ء میں جب روس نے افغانستان پر حملہ کیا تو افغانستان کے بہت سے باشندے ہجرت کر کے پاکستان آگئے۔ ان میں افغانستان کی سابق کابینہ کے وزراء بھی شامل تھے۔ پاکستان میں ایک پریس کانفرنس کے موقع پر وزراء کا تعارف کرایا

جارہا تھا اور سابق وزراء کے ناموں کے ساتھ ان کے محکموں کے نام بھی بتائے جارہے تھے۔ ایک سابق وزیر صاحب کے بارے میں بتایا گیا کہ یہ افغانستان کے سابق وزیر ریلوے تھے۔

ایک صحافی نے حیران ہوکر سوال کیا کہ "افغانستان میں تو ریلوے کا انتظام ہی نہیں پھر بھلا وزیر ریلوے کا کیا کام؟"

جواب ملا کہ، "ہم نے کبھی آپ سے پوچھا کہ آپ کے ملک میں وزارتِ قانون کیوں ہوتی ہے؟"

مرسلہ ...... محمد راشد، گارڈن کراچی

ماں (بیٹے سے) "بیٹا......! آگے مت جاؤ، وہاں پانی زیادہ گہرا ہے۔"

ماں ...... "نہیں بیٹا! ان کی زندگی کا تو بیمہ ہوچکا ہے۔"

نادیہ قاسم، ہاجرہ قاسم ...... جوڑیابازار کراچی

ایک کنجوس کے بیوی بچے مرچکے تھے۔ وہ ہر ماہ ٹوتھ پیسٹ خریدتا تھا، جس کے ساتھ پین، پنسل یا جیومیٹری بکس ملتا تھا۔ وہ انہیں سنبھال کر رکھتا اور کسی کو نہیں دیتا۔ ایک دن محلے کے کسی شخص نے اس سے پوچھ لیا۔

"آخر تم یہ چیزیں کسی کو دے کیوں نہیں دیتے، خواہ مخواہ سنبھال کر رکھتے ہو، تمہارے تو بیوی بچے بھی نہیں ہیں؟"

"تو کیا ہوا، قیامت کے دن تو ملاقات ہوگی۔ اس دن دے دوں گا۔"

مرسلہ ...... حمیرا تبسم، ملّی ٹھٹھہ

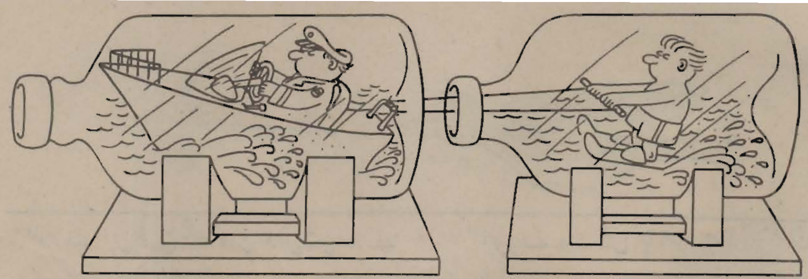

ایک صاحب نے اپنے ایک دوست کو ایک مریل گھوڑا تحفے میں دیا جو ایک رات بھی زندہ نہ رہ سکا۔ چند دن بعد صاحب نے دوست سے پوچھا،

''گھوڑا کیسا ہے؟''

''کافی تیز دوڑتا ہے۔'' دوست نے جواب دیا۔

''کیا واقعی؟''

ہاں واقعی......! اتنا تیز دوڑا کہ ایک ہی رات میں اس دنیا سے دوسری دنیا میں پہنچ گیا۔''

مرسلہ...... سید مسرور حسین، کوہاٹ

ایک دوست (دوسرے سے) ''سڑک کے کونے پر جو ڈیری ہے، اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟''

دوسرا دوست...... ''اول درجے کی ڈیری ہے۔ اس میں صفائی کے اصولوں کا پورا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ دودھ میں ملانے سے پہلے پانی بھی ابالا جاتا ہے۔''

مرسلہ...... جنید رؤف، بلدیہ ٹاؤن کراچی

منیجنگ ڈائریکٹر نے سیلز منیجر کو اپنے دفتر میں طلب کیا اور کہا،

''میں تمہیں ترقی دے کر سیلز ڈائریکٹر بنا رہا ہوں اور تمہاری ماہانہ تنخواہ میں ایک ہزار روپے اضافہ کر رہا ہوں اور تمہیں اسٹاک کے ضمن میں اختیارات بھی دیئے جا رہے ہیں۔ تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟''

''شکریہ ڈیڈی......!'' سیلز منیجر نے جواب دیا۔

مرسلہ...... محمد ریحان، اسلام آباد

ایک دوست...... (اپنے بہت کاہل دوست سے) ''تم اتنے کاہل ہو تو کاہلی کے بین الاقوامی مقابلے میں حصہ لے کر گولڈ میڈل حاصل کیوں نہیں کر لیتے؟''

کاہل دوست...... (ایک لمبی جمائی لے کر) ''ہاں......! مگر کون حصہ لے۔''

مرسلہ...... عرفان احمد / رضوان احمد کراچی

ایک صاحب جب کار پارکنگ میں اپنی کار کے قریب پہنچے تو ایک پولیس مین نے ان سے کہا،

''محترم! آپ کی کار کی نمبر پلیٹ اُلٹی ہے۔''

اس پر وہ صاحب مسکرا کر بولے، ''مجھے

معلوم ہے۔ اس طرح مجھے کار کی تلاش میں سارے پارک کا چکر نہیں لگانا پڑتا۔"

مرسلہ ...... جہانزیب غنی، محمود آباد

ہیڈ ماسٹر صاحب کلاس میں آئے تو انہوں نے دیکھا کہ لڑکے آپس میں باتوں میں لگے ہوئے ہیں اور ایک کتاب ڈیسک کے نیچے گری پڑی ہے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کو دیکھتے ہی پوری کلاس احتراماً کھڑی ہوگئی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے غصے سے پوچھا:

"یہ کتاب کس کی ہے؟"

"مولانا حالی کی" ایک لڑکے نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

مرسلہ ...... اظہر خان، جاویداں سیمنٹ لمیٹڈ۔

ڈرائنگ روم میں سجے ہوئے شیر کو دیکھ کر مہمان نے میزبان سے پوچھا:

"بڑا خوبصورت شیر ہے کہاں سے حاصل کیا؟"

"بھارت سے!" دوست نے جواب دیا۔

"پچھلے سال اپنے چچا کے ساتھ شکار کھیلنے گیا تھا۔"

"اس کے پیٹ میں کیا بھرا ہے؟" مہمان نے سوال کیا۔

جواب ملا۔ "میرے چچا۔"

مرسلہ ...... محمد دانیال اسحاق۔ حیدر آباد

ایک صاحب اپنے دوست کے گھر رہنے گئے۔ دوست کا ایک ہی بچہ تھا جن سے صاحب ہر وقت باتیں کرتے رہتے۔ بچہ ان کے ہر وقت بولنے سے بے حد تنگ تھا۔

ایک دن صاحب نے بچے سے کہا:

"منے میاں! اگر میں کہوں کہ ابھی رات ہو رہی ہے مگر دن کا وقت ہو تو تم کیا کرو گے؟"

"ابو سے کہوں گا کہ آپ کو پاگل خانے لے جائیں۔"

بچے نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

مرسلہ ...... فیصل سلطان قادری۔ کراچی

باپ تکیے کے نیچے مٹھائی رکھ کر گیا جو بچے نے کھالی اور تکیہ اپنے پیٹ پر رکھ لیا۔ باپ آیا تو پوچھا: "مٹھائی کہاں ہے؟"

"تکیے کے نیچے"۔ بچے نے معصومیت سے جواب دیا۔

مرسلہ ...... فیصل سلطان قادری، کراچی۔

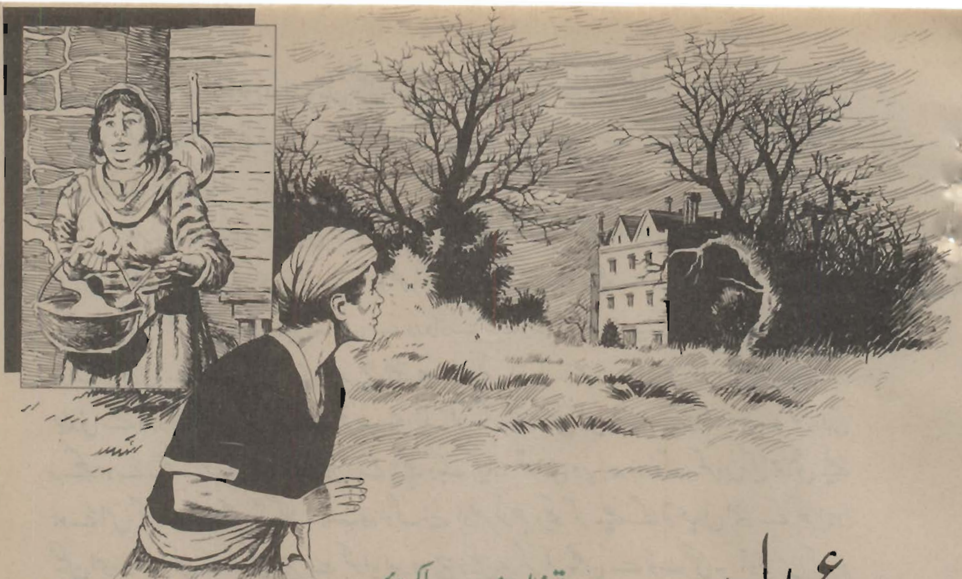

عبدل

تمثال مسعود، لکھنؤ

عبدل ایک دُبلا پتلا آدمی تھا۔ اس کی بیوی اسے بے کاری کے طعنے دیتی اور بُرا بھلا کہتی رہتی تھی۔ بے چارہ عبدل اس کی ساری باتیں چپ چاپ سہ لیتا تھا۔ ایک دن اسے کوئی کام نہ ملا اور وہ خالی ہاتھ گھر لوٹا۔ یہ دیکھ کر اس کی بیوی کا خون کھول اٹھا۔ اس نے بے چارے عبدل کی خوب پٹائی کی اور اس کے پورے خاندان کو بُرا بھلا کہنے لگی۔ عبدل کو غصہ تو بہت آیا لیکن اپنی بیوی کا لمبا چوڑا بدن دیکھ کر چپ رہ گیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب سے گھر چھوڑ کر جنگل میں رہا کرے گا، اور اسی رات چپکے سے گھر سے نکل گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایسے گھر سے تو جنگل ہی اچھا ہے۔ وہ جنگل کی طرف بھاگنے لگا۔ جنگل کے بیچوں بیچ پہنچ کر وہ رات گزارنے کے لئے ادھر ادھر جگہ تلاش کرنے لگا۔ دور پر اسے کچھ روشنی سی دکھائی دی اور وہ اس کی طرف چل پڑا۔ قریب پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک اونچی سی شاندار حویلی ہے۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اتنی شاندار حویلی اس اُجاڑ ویرانے میں کہاں سے آگئی۔ اس نے سوچا کہ پہلے کبھی شاید کوئی راجا ہوگا جو جنگل میں شکار کھیلنے کے بعد یہاں آرام کرتا ہوگا۔ یہ سوچ کر وہ اندر چلا گیا۔

اندر سے حویلی ایک دم صاف ستھری تھی۔ عبدل نے حویلی کا ایک چکر لگایا۔ اپنے سونے کے لئے کمرے کی تلاش میں وہ جب اوپر جانے والے لکڑی کے زینوں پر چڑھ رہا تھا تو دھم دھم کی آواز ہو رہی

تھی۔ سونے کا کمرہ ملتے ہی وہ اس میں بچھی ہوئی مسہری پر آرام سے لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ جب اس حویلی میں کوئی رہتا نہیں تو یہ اتنی صاف ستھری کس طرح ہے؟ یہی سب سوچتے سوچتے عبدل کو نیند آگئی اور وہ بے خبر سو گیا۔

سویرے سویرے عبدل کی آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہے کہ پورا کمرہ دھول سے اٹا ہوا ہے اور اس میں مُردہ جانوروں کی سی بُو بسی ہوئی ہے۔ وہ گھبرا کر اُٹھا ہی تھا کہ اسے نیچے سے زینوں پر بہت سے لوگوں کے چڑھنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے دروازے سے جھانک کر زینے کی طرف دیکھا تو سُوکھے ہوئے مُردوں کے سے کئی آدمی اوپر چڑھتے ہوئے نظر آئے۔ عبدل دل ہی دل میں چیخ اٹھا اور جلدی سے دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ قریب ہی ایک اور کمرہ تھا جس میں بہت سے بڑے بڑے صندوق رکھے ہوئے تھے۔ عبدل ان صندوقوں کے پیچھے دبک گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ لوگ کمروں کی تلاشی لیتے ہوئے اس کمرے میں بھی آگئے۔ جب وہ لوگ اسے اِدھر اُدھر دیکھ کر چلے گئے تو عبدل اٹھ کے کھڑا ہوا لیکن اسی وقت اس کا سر کسی چیز سے ٹکرایا اور وہ چیز زمین پر گر کر چھن سے ٹوٹ گئی۔ آواز سن کر وہ سُوکھے ہوئے لوگ پلٹ کر کمرے کی طرف دوڑ پڑے۔ عبدل کی سمجھ میں اور کچھ نہیں آیا تو وہ لپک کر ایک صندوق میں گھس گیا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ کسی مُردہ بدن کے اوپر لیٹا ہوا ہے اس نے گھبرا کر اٹھنا چاہا تھا کہ کمرے کے اندر صندوقوں کے ڈھکنے کھُلنے اور بند ہونے کی آوازیں گونجنے لگیں۔ عبدل سمجھ گیا کہ وہ لوگ اسے صندوقوں کے اندر ڈھونڈ رہے ہیں۔ عبدل نے اس مُردے کو جس کے اوپر وہ لیٹا تھا بڑی مشکل سے کھینچ کر اپنے اوپر کر لیا اور جہاں تک ہو سکا خود کو اس کے نیچے چھپا لیا۔ کچھ دیر بعد اس کے صندوق کا بھی ڈھکنا کھولا گیا لیکن وہ تلاشی لینے والوں کو نظر نہیں آیا اور آخر وہ سب پھر کمرے سے باہر نکل گئے۔ کچھ دیر بعد ان کے زینے اترنے کی آوازیں آئیں تو عبدل نے صندوق سے باہر نکلنے کے لئے اپنے اوپر پڑے ہوئے مردے کو ہٹانا چاہا لیکن اچانک وہ اتنا بھاری ہو گیا کہ عبدل اسے ہلا تک نہیں سکا۔ اب اسے یاد آیا کہ ایسے موقعوں پر دُعائیں بہت کام آتی ہیں۔ اسے نے جلدی جلدی ایک دعا پڑھنا شروع کی لیکن گھبراہٹ کی وجہ سے پوری دُعا اس کو یاد نہیں آرہی تھی جس کی وجہ سے وہ مُردہ ہر بار صرف ہل کر رہ جاتا تھا۔ بڑی مشکل سے عبدل نے پوری دُعا پڑھی، اس کے ساتھ مُردہ اتنا ہلکا ہو گیا کہ عبدل اس کو اپنے اوپر سے ہٹا کر صندوق سے باہر نکل آیا۔ اس کی ناک میں مُردوں کی بو بسی ہوئی تھی اور اس کا بہت جی چاہ رہا تھا کہ کسی کھلے ہوئے باغ میں جائے جہاں ہر طرف پھول ہی پھول ہوں۔ وہ دروازے کی طرف لپکا لیکن دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا تھا۔ اس کے اوپر ایک روشن دان تھا لیکن وہ اتنی

اونچائی پر تھا کہ عبدل کا ہاتھ اس تک نہیں جاسکتا تھا۔ اب اس نے روشن دان تک پہنچنے کے لئے ایک صندوق کو گھسیٹ کر دروازے تک لانا چاہا لیکن وہ صندوق بہت وزنی تھا۔ عبدل نے سوچا کہ اس میں بھرا ہوا سامان نکال دیا جائے تو شاید اسے کھسکانے میں آسانی ہو۔ یہ سوچ کر اس نے صندوق کا ڈھکنا کھولا تو اندر چھوٹی چھوٹی تھیلیاں بھری ہوئی نظر آئیں۔ عبدل ان تھیلیوں کو نکال نکال کر باہر رکھنے لگا تو ان میں کھنکھناہٹ کی آواز سن کر اس کے کان کھڑے ہوئے۔ اس نے ایک تھیلی کھولی تو وہ اشرفیوں سے بھری ہوئی تھی۔ یہ دیکھ کر عبدل کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے جھٹ پٹ دو تھیلیاں اٹھا کر اپنی کمر میں باندھیں، صندوق کو کھینچ کر دروازے تک لایا۔ روشن دان پر چڑھا اور باہر کی طرف کود گیا۔ اسے کچھ دور پر ایک پتلا سا زینہ نیچے کی طرف جاتا دکھائی دیا۔ وہ زینے سے چپکے چپکے نیچے اترا۔ اب اس کو ایک بڑا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا نظر آیا۔ دروازے کے دوسری طرف دن کی روشنی تھی۔

اس دروازے سے نکل کر عبدل نے خود کو کھلے ہوئے جنگل میں پایا وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ کچھ دور جانے کے بعد اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ حویلی کا کہیں پتا نہ تھا اور اس کی جگہ ایک پرانا قبرستان نظر آرہا تھا۔

حویلی کے غائب ہو جانے پر عبدل کو حیرت ہوئی لیکن جب اسے پتا چلا کہ اس کی کمر میں بندھی ہوئی اشرفیوں کی دونوں تھیلیاں بھی غائب ہیں تو اسے حیرت سے زیادہ افسوس ہوا۔ لیکن عبدل کو اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ان سوکھے ہوئے مردوں کو دیکھنے کے بعد اب وہ اپنی موٹی تازہ بیوی سے ڈرتا نہیں ہے۔

عادل ہوٹل میں داخل ہوا تو سامنے کی میز پر ایک شخص بیٹھا ناشتا کر رہا تھا، اس کے آگے پراٹھے اور دو باتیں، انڈوں کا ہاف فرائی تھا، عادل کے منہ میں پانی بھر آیا لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، وہ جب بھی "مہربان ہوٹل" میں داخل ہوتا ایسے ہی منظر دیکھا کرتا۔ زندگی کبھی اس پر مہربان نہ ہوئی تھی "مہربان ہوٹل" اس پر کیا مہربان ہوتا۔ عجیب بات تھی، وہ بس ایک ہی خواب دیکھا کرتا تھا عمدہ اور طرح طرح کے

تعبیر

مرزا تیمور بیگ

کھانوں کا خواب۔ وہ کبھی کبھار کوئی کام کر لیا کرتا تھا مگر اس کو کوئی کام ملے ہوئے بھی کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ ریٹائر ہوئے کوئی سال بھر کے قریب ہو چکا تھا اور اب وہ پنشن کے سہارے گزارہ کر رہا تھا مگر جس طرح مہنگائی شیطان کی آنت کی طرح بڑھتی جارہی تھی اسی طرح اس کی پنشن بھی سکڑتی سمٹتی جارہی تھی، کل ہی اسے ایک ٹیوشن ملی تھی جس سے پیٹ بھرنے کے لئے تینوں وقت ایندھن تو مل جاتا تھا مگر دل نہیں بھرتا تھا۔ اچھے کھانے کی خواہش کسی ضدی بچے کی طرح اس کے پیٹ میں بلبلاتی رہتی تھی اس وقت بھی دل پر پتھر رکھ کے اس میز کی طرف بڑھ گیا جو کونے میں رکھی تھی اور جس پر کم ہی گاہک بیٹھے تھے میز پر بیٹھ کر اس نے

دونوں ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈالے اور ہال کا جائزہ لینے لگا باہر سردی تھی اور اس سردی سے بچنے کے لئے اس کا پرانا کوٹ ناکافی تھا اس کا بہت جی چاہا کہ گرما گرم مغز نہاری کی ڈبل پلیٹ منگالے کیونکہ اس کا لطف تو کڑکڑاتی سردی میں آتا ہے پھر اس خیال ہی دہشت نے اس کے ارادے کو توڑ دیا کہ باقی دن کیسے گزریں گے؟ ایک دفعہ بجٹ کا توزان بگڑ گیا تو اس کا سنبھالنا ناممکن ہو جائے گا یوں بھی وہ ادھار لینے کا قائل نہیں تھا کسی سے پیسے مانگنے کے خیال سے ہی اسے شرم آتی تھی۔ اسی لئے آج تک اس نے کسی سے ادھار نہیں لیا تھا وہ سمجھتا تھا کہ آدمی کو چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہئیں ابھی وہ اپنی سوچوں میں گم تھا کہ بیرے نے اس کے سامنے ایک پچکا ہوا بند اور بھاپ اڑاتی ہوئی چائے لا کر رکھ دی۔ گرمی ہو یا سردی یہی اس کا ناشتہ تھا ہوٹل کے بیرے کو کہنے کی ضرورت نہ تھی جیسے یہ مسکہ بن نہ ہو کسی موذی مرض کی دوا ہو جس کا کھانا ضروری ہو اس مسکہ بند میں اس کی درد بھری زندگی کا عکس تھا اس کا ذائقہ زبان پر زندگی کی چھوٹی بڑی تلخیوں کا سا مزہ دیتا تھا یہ کوئی زہر تھا جسے وہ بڑے دکھ، کرب، اذیت اور بدمزگی سے اپنے حلق میں اتارتا تھا تب اس کو دنیا کے تنگ دھڑنگ اور بھوکے لوگوں کا خیال آتا جن کو ایک وقت کی روٹی بھی میسر نہ تھی اور جسم ڈھکنے کو کپڑے نہ تھے۔ یہ سوچ کر وہ اس بند کو زہر مار کرتا تھا اور خدا کا شکر ادا کرتا تھا۔

آج بھی اس نے چائے کا آخری گھونٹ لیا اور اٹھا اور کاؤنٹر پر بل ادا کر کے باہر کی طرف چل دیا۔ وہ ٹہلتا ہوا ایک پارک میں پہنچا۔ یہاں ایک بہت بڑا گراؤنڈ تھا جس میں اچھا خاصا ہجوم رہتا تھا وہ ایک طرف چھاؤں میں گھاس پر بیٹھ گیا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک گاڑی بہت سے لوگوں کو لئے پارک میں داخل ہوئی جس میں مرد بھرے ہوئے تھے اور ساتھ میں دو ایک لڑکیاں بھی تھیں جب وہ گاڑی سے اترے تو اس نے دیکھا کہ سارے مرد سفید لباس میں تھے اور کرکٹ کے کھلاڑی لگ رہے تھے ان کے پاس گیند بلا اور وکٹیں بھی تھیں اس ہجوم میں اس نے ایک نوجوان کو دیکھا اور دیکھتے ہی پہچان لیا کہ وہ کرکٹ کا کھلاڑی تھا وہ اپنے ہاتھوں میں بلا لئے ایک طرف کھڑا کچھ لوگوں سے باتیں کر رہا تھا دو آدمی بیچ میں جا کر وکٹیں گاڑنے لگے کیمرہ مین کھڑا زاویہ بنا رہا تھا ایک ادھیڑ عمر شخص جس کے گلے میں پڑی ہوئی تھی لوگوں کو ہدایت دینے لگا پھر وہ ایک دم سے اچھل پڑا "عارفین صاحب کہاں ہیں؟"

"ان کے پیٹ میں درد تھا وہ دفتر میں رہ گئے۔" ایک شخص نے جواب دیا۔

"تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟" ہدایت کار چیخا۔

"میں سمجھا کہ عارفین صاحب نے آپ کو بتادیا ہے۔" "اب کیا ہوگا .... ایمپائر کسے بنائیں گے؟" ہدایت کار نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

"یہ صاحب کیسے رہیں گے؟ دوسرے شخص نے عادل کی طرف اشارہ کیا۔

"کون صاحب...... ؟ ہدایت کار نے اس کی طرف دیکھا اور کہا "ہاں یہ ٹھیک رہیں گے۔"
ہدایت کار نے اس کے قریب پہنچ کر اسے سلام کیا اور کہا کہ ہم آپ کو ایک زحمت دینا چاہتے ہیں۔
"کیسی زحمت؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔
"ہم آپ کو ایمپائر بنانا چاہتے ہیں۔"
"مگر مجھے تو ایمپائرنگ نہیں آتی۔" وہ بولا۔
"آپ کو ایمپائرنگ جاننے کی ضرورت نہیں آپ کو صرف ہاتھ ہلانا ہوگا۔"
"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟"
"ہم لوگ ایک اشتہاری فلم بنا رہے ہیں۔" ہدایت کار کہنے لگا۔ "ہم آپ کے چند شاٹ فلمائیں گے ان شاٹ میں آپ چوکے اور چھکے کے اشارے کریں گے میں آپ کو بتادوں گا کس طرح ہاتھ اٹھانے ہیں یہ بہت آسان کام ہے
"تو آپ مجھے ماڈل بنا رہے ہیں جی نہیں میں یہ کام نہیں کروں گا۔" اس نے صاف انکار کر دیا
"صرف پانچ سات منٹ کی بات ہوگی۔" ہدایت کار نے اس کو سمجھایا۔
"ہم آپ کو اس کا معاوضہ دیں گے۔"
"معاوضہ......؟"
"جی ہاں!" ہدایت کار نے سرہلایا۔
"ایک سو روپے۔"
"ایک سو روپے!..... اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھوڑی دیر بعد میک اپ مین ان کے سامنے کھڑے تھے ہدایت کار نے اس کو کالی پتلون پہننے کے لئے دی انہوں نے اسے اپنی پتلون پر ہی چڑھا لیا اور پھر سفید کوٹ اور بڑا سا ہیٹ بھی اسے پہننا پڑا تھا۔
جیسے ہی شاٹ مکمل ہوئے ہدایت کار نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے سو روپے کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔
وہاں سے وہ سیدھا "مہران ہوٹل پہنچا تو دوپہر کا ایک بج رہا تھا بیرے کو معلوم تھا کہ اس کے دوپہر کا کھانا کیا ہے اس لئے وہ دال چپاتی لے آیا اس نے بیرے کو گھور کر دیکھا "یہ میں نے کب کہا تھا کہ تم دال چپاتی لے آؤ؟"
"پھر آپ کیا کھائیں گے؟" بیرے نے حیرت سے پوچھا۔ "مرغ ہاؤ۔" اس نے اپنے ہونٹوں پر

زبان پھیری ۔

"وہ پندرہ روپے پلیٹ ہے۔"

"تو کیا ہوا؟ اس نے تند لہجے میں کہا۔" اور ہاں سنو سینہ نہیں ران چاہئے "ران"۔ اس نے اونچی آواز میں ہدایت دی بیرا چلا گیا کھانا ختم ہوا تو بیرے نے پوچھا آپ سوئٹ ڈش میں کیا لیں گے؟

"پڈنگ" اس نے جواب دیا

چائے پی کر وہ کاؤنٹر پر پہنچا بیرے نے آواز لگائی "اٹھائیس روپے"۔ ہوٹل کا مالک اس کی طرف مسکرا کر دیکھنے لگا اس نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا پھر ایک ایک کر کے ساری جیبیں دیکھ ڈالیں اس سو کے نوٹ کا کہیں پتہ نہیں تھا اسے ایک دم سے یاد آیا کہ سو کا نوٹ تو اس کالی پتلون میں رہ گیا جو ہدایت کار نے اس کو پہننے کو دی تھی اور جسے وہ اپنے ساتھ واپس لے گئے تھے۔

اسٹوری ٹائم

ریڈیو سے ہر شام 7:50 پر

احمد فوڈ انڈسٹریز کے تعاون سے

ملک بھر کے ریڈیو اسٹیشن بچوں کے لئے پیش کرتے ہیں

کہانیوں کا ایک دلچسپ اور مزے دار سلسلہ

ہر شام کہانی ۔ ہر شام سہانی

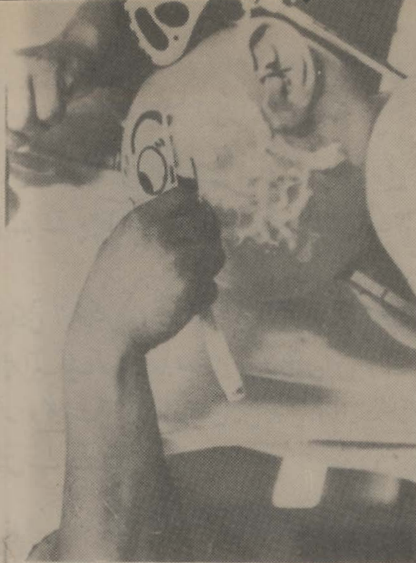

آنکھ مچولی البم

میرا نام لٹل ماسٹر جیری ہے۔

موسم بہار کی ایک دوپہر مجھے بنایا گیا جب مجھے بنایا جارہا تھا تو میں نے سمجھا کہ شاید مجھے بیوقوف بنایا جارہا ہے۔ لیکن پھر میں نے محسوس کیا کہ پہلے میرا گول گول چہرہ بنا۔ پھر میری آنکھیں بنیں۔ ناک۔ اور منہ بنے اور یوں میں مکمل ہوگیا ...... آپ ان تصویروں میں مجھے بنتے دیکھ سکتے ہیں۔ دیکھئے ...... اب میں ...... لٹل ماسٹر جیری ...... بالکل پروفیسر لگ رہا ہوں نا۔

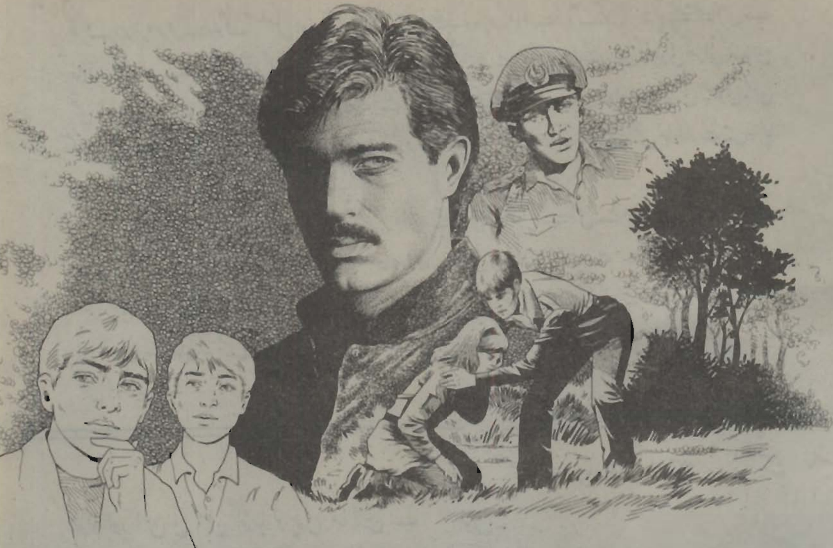

کرشمہ

قسط - ۷

اظہر نیاز

گزشتہ قسطوں کا خلاصہ

جواد، ذیشان کا دوست تھا۔ وہ حیرت انگیز صلاحیت کا مالک تھا جسے ذیشان کے ابو آغا عمران نے چھٹی حس کا نام دیا تھا۔ جواد کو آنے والے خطرات کا پہلے سے علم ہو جاتا تھا اور اس حس کا مظاہرہ وہ اکثر کرتا رہتا تھا۔ آغا عمران پولیس افسر تھے۔ جواد نے کئی کیسوں میں ان کی بھرپور مدد کی تھی۔ جواد کو ٹی وی ڈراموں میں کام کرنے کا بہت شوق تھا۔ آغا عمران نے اپنے ایک دوست پروڈیوسر انصاری صاحب سے سفارش کر کے جواد کو ڈراموں میں کام کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔ انصاری صاحب بھی جواد کی پراسرار قوت سے بہت متاثر ہوئے ریہرسل کے دوران جواد کی ملاقات مس نائلہ سے ہوئی جو شہر کے ایک بااثر شخص کی بیٹی تھی۔ آغا عمران اور انسپکٹر شعیب کا خیال تھا کہ نائلہ کا باپ. سخی بٹ منشیات کے کاروبار میں ملوث ہے مگر ان کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ انسپکٹر شعیب مسلسل سخی بٹ پہ نظر رکھے ہوئے تھے۔ دوسری

طرف چند پراسرار سے لوگ مسلسل جواد کے تعاقب میں تھے۔ وہ سرراہ اسے روک کر راستہ پوچھتے اور اس کے خلاف عمل کر کے جواد کی پیشن گوئیوں کا امتحان کرتے جو اکثر صحیح ثابت ہوتیں۔ پولیس ان افراد کی نگرانی کر رہی تھی جن کے بارے میں شک تھا کہ وہ سخی بٹ کے آدمی ہو سکتے ہیں۔ ایک دن جواد اور اس کی چھوٹی بہن گڑیا اپنی سائیکلوں پر شام کی سیر کے لئے نکلے تو چند مشکوک افراد نے انہیں اغوا کر کے ایک محل نما عمارت میں پہنچا دیا۔ محل کے مالک کا نام پرنس احسن تھا۔

ذیشان اور اجلال، جواد کی تلاش میں سرگرداں تھے وہ شید اپستول سے بھی ملے اور وہیں سے انہیں ایک پرچی ملی جس پر کوڈورڈز میں ایک ٹیلی فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ اجلال نے بڑی محنت سے اسے ڈی کوڈ کیا۔ مگر اس نمبر پر ایک پٹھان چوکیدار کے علاوہ کسی سے بات نہ ہو سکی۔ اسی دوران میں آغا عمران گھر میں داخل ہوئے اور انہوں نے بتایا کہ جس مجرم کو انسپکٹر شعیب نے بڑی محنت سے گرفتار کیا تھا کسی نے حوالات کے اندر اسے قتل کر دیا ہے۔

اب آپ آگے پڑھئے

جواد اور اس کی بہن گڑیا کو پری نما لڑکی نے آکر بتایا کہ محل کا مالک پرنس احسن ان سے ملنے آرہا ہے۔ اس لئے وہ کھانا کھالیں لیکن جواد نے سختی سے انکار کیا۔

"جب تک وہ نہیں آئے گا، ہم کھانا نہیں کھائیں گے۔"

"بھیا...... مجھے سخت بھوک لگی ہے۔"

"خبردار جو تم نے کھانے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا۔" جواد نے گڑیا کو ڈانٹا اور وہ منہ بسورتے ہوئے آنکھوں میں آنسو لئے ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔ اتنے میں اس خوبصورت کمرے کا دیوہیکل دروازہ کھلا اور ایک اسمارٹ سا آدمی گھڑ سواری کا لباس پہنے، ہاتھ میں گھوڑا ہانکنے والی چھڑی لئے کمرے میں داخل ہوا۔

"میرے پیارے دوستو......! میں حاضر ہوں۔"

"تو تم اس محل کے مالک ہو؟" جواد نے غصے سے پوچھا۔

"اور اگر میں کہوں کہ ہاں، تو پھر؟"

"تو پھر تم نے ہمیں کیوں قید کر رکھا ہے...... تمہیں بچے اغوا کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟"

"میرے دوست میں بچے اغوا نہیں کرتا۔ میں تو تم سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔"

"تو تم دوست اغوا کرتے ہو؟"

"جیسا تم سمجھ لو......"

"کیوں، کیوں تم نے ہمیں اغوا کیا ہے؟"

"اگر تم کھانا کھالو...... تو میں سب کچھ تمہیں بتا دوں گا۔"

"ہاں بھیا، کھانا کھا لیتے ہیں۔ " گڑیا نے کہا۔

"دیکھو" ، پرنس احسن نے جواد سے کہا۔ "ایک شرط میں نے تمہاری مان لی ہے۔ اب تم میری بات مان لو. کھانا کھالو گے تو میرا وعدہ رہا...... میں تمہیں ہر بات سمجھا دوں گا۔" پرنس احسن نے اپنا ہاتھ دوستی کے انداز میں آگے بڑھاتے ہوئے کہا...... "میرا نام احسن ہے، پرنس احسن...... اور میرے دوست، پرنس احسن اپنے ایک ایک لفظ کا پاس کرتا ہے۔ "

جواد نے ہاتھ ملایا اور پھر بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ پرنس احسن کمرے سے چلا گیا لیکن وہ پری نما لڑکی ان کے پاس بیٹھی رہی۔ کھانا کھانے کے بعد اس لڑکی نے جواد سے کہا، "تم میرے ساتھ آؤ۔ "

"اور گڑیا؟ " جواد نے پوچھا۔

"گڑیا یہیں رہے گی۔ اس کمرے میں۔ "

چند راہداریاں اور دالان عبور کرنے کے بعد جواد ایک طویل و عریض کمرے میں داخل ہوا۔ لڑکی دروازے سے واپس لوٹ گئی۔ سامنے کمرے کے دوسرے سرے پر پرنس احسن ایک تخت پر براجمان تھا۔

"خوش آمدید، خوش آمدید میرے دوست۔ " اس نے کہا۔

"ہاں بات یہ ہے کہ ہمیں پتا چلا ہے کہ تم کسی عجیب و غریب قوت کے مالک ہو، چھٹی حس۔ بلکہ ساتویں حس کے مالک ہو۔ ہم نے تمہارے پیچھے اپنے آدمی لگائے، انہوں نے تمہارے بارے میں معلومات اکٹھی کیں۔ تمہیں جانچا، پرکھا اور ہمیں رپورٹ دی کہ تم قدرت کا کرشمہ ہو۔ بس مجھے قدرت کا یہ کرشمہ پسند آگیا اور ...... بہرحال ہم کچھ ایسے کام کرتے ہیں جسے تمہاری دنیا والے ناجائز کہتے ہیں۔ جب کہ ہم اسے امپورٹ ایکسپورٹ کہتے ہیں اِدھر کا مال اُدھر، اُدھر کا مال اِدھر...... راستے میں کچھ خطرات ہوتے ہیں، کچھ حادثات، کچھ اتفاقات، کہیں پولیس، کہیں کسٹم، کہیں مخبر، کہیں غدار، کہیں چور اُچکے، ہمارے مخالف گروہ ...... ہمیں ان سب سے بچنا ہوتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ تم ہمارے لئے کام کرو، ہمارے قافلے کے لئے وقت اور راستے کا تعین کرو۔ کب ہم جائیں، کب نہ جائیں، کون سے راستے سے جائیں اور کون سے راستے سے نہ جائیں، کس دن جائیں اور کس دن نہ جائیں۔ "

"اور میری بہن گڑیا کو آپ نے کیوں اغوا کیا؟ "

"وہ۔ اگر تم ہمارے ساتھ کام کرنے کو تیار ہو جاؤ تو اسے اسی دن تمہارے گھر واپس بھیج دیا جائے گا۔ "

"اور اگر میں یہ کام کرنے کے لئے تیار نہ ہوں تو؟"

"تو پھر......! تو پھر؟؟ وہ اپنے غصے کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ محل کا وہ کمرہ جو اب تم دونوں کے لئے جنت کی طرح ہے دوزخ میں بدل جائے گا۔"

.... ○ ....

جواد کے امی ابو سخت پریشان تھے کیونکہ ابھی تک ان کے بچے اغوا کرنے والوں نے ان سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ آغا عمران کا بھی یہی خیال تھا کہ چند روز میں ٹیلی فون آجائے گا کہ اتنے پیسے لے کر فلاں جگہ پر آجاؤ۔ وہ ہر لمحے جواد کے ابو اشتیاق علی احسن سے رابطہ رکھے ہوئے تھے کہ جوں ہی آپ سے کوئی رابطہ کرے آپ فوراً مجھے اطلاع دیں۔ جواد کے گھر فون کو بھی چیک کیا جا رہا تھا اور فون کو ریکارڈ کرنے کے آلات بھی آغا صاحب نے لگوا دیئے تھے لیکن جواد کو اغوا کرنے والوں نے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ ذیشان اور اجلال روزانہ جواد کے امی ابو سے ملنے جاتے تھے اور ان کو تسلی دیتے کہ جواد اور گڑیا جلد گھر واپس آجائیں گے۔ کئی دن گزر گئے تھے لیکن جواد اور گڑیا کا کوئی پتہ نہیں چل رہا تھا۔ ایک دن اخبار پڑھتے ہوئے ذیشان یکدم چونکا۔

"ابو۔ ایک بات تو بتائیں۔"

"جی فرمائیے۔"

"کیا مجھے گزشتہ ایک ہفتے کی رپورٹ مل سکتی ہے۔"

"کیسی رپورٹ؟" آغا عمران نے پوچھا۔

"یہی کہ آپ کے علاقے میں کتنے اسمگلر پکڑے گئے، کتنوں کے ساتھ پولیس مقابلہ ہوا یا کوئی اسمگلنگ کا سامان پکڑا گیا۔"

آغا عمران مسکرائے۔ "تو تم اس رپورٹ کا کیا کرو گے۔"

"ابو۔ میں کئی دنوں سے اخبارات میں چند خبروں کی کمی دیکھ رہا ہوں۔ کہیں کوئی ٹرک نہیں پکڑا جاتا۔ کسی جگہ مقابلہ نہیں ہوتا، کوئی اسمگلر مارا نہیں جاتا۔ یہاں تک کہ آپ کے ایس ایس پی راؤ اقبال صاحب بہت دنوں سے ٹیلی ویژن پر نظر نہیں آرہے۔ انہوں نے کوئی پریس کانفرنس نہیں کی۔ لگتا ہے پاکستان میں اسمگلنگ بالکل ختم ہوگئی ہے۔"

"لڑکے۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔" آغا عمران نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"ابو۔ اگر آپ میری بات کی تصدیق کریں تو پھر بات آگے بڑھ سکتی ہے۔"

"ایک منٹ۔ آغا عمران نے فون اٹھایا اور انسپکٹر شعیب کے نمبر گھمائے۔"

"ہاں لڑکے۔ مجھے گزشتہ پندرہ دنوں کی رپورٹ چاہئے۔ جی۔ اسمگلنگ کے بارے میں کوئی بھی خبر خاص طور پر ڈرگ کے بارے میں کسی قسم کی رپورٹ۔ ہاں راؤ صاحب سے بات کرسکتے ہو۔ ہاں ٹیلی فون پر بتا دینا۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ذیشان اخبار پڑھتا رہا آغا عمران خلا میں گھورتے رہے۔ چند لمحوں بعد فون کی گھنٹی بجی اور آغا عمران خاموش کچھ سنتے رہے اور پھر انہوں نے انسپکٹر شعیب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ریسیور کریڈیل پر رکھ دیا۔

"لڑکے۔" آغا عمران نے ذیشان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارا خیال ٹھیک ہے۔ کوئی ایک ہفتہ پہلے تک اسمگلروں اور منشیات فروشوں سے مڈبھیڑ ہو جاتی تھی لیکن گزشتہ ہفتہ سے منشیات فروش بالکل غائب ہوگئے ہیں۔"

"اور ایک ہفتہ سے جواد غائب ہے۔" ذیشان نے کہا۔

"کیا مطلب؟ آغا عمران نے عجیب نظروں سے ذیشان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ویری سمپل ابو۔" جواد کو اسمگلروں یا منشیات فروشوں کے کسی گروہ نے اغوا کیا ہوا ہے اور جواد کی ساتویں حس کے بارے میں آپ جانتے ہی ہیں۔"

"تو کیا جواد منشیات فروشوں کے لئے کام کر رہا ہے؟" آغا عمران نے ذیشان سے ایسے پوچھا جیسے وہ سب کچھ جانتا ہے، جیسے وہ کوئی تجربہ کار پولیس افسر ہے۔

"یہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" ذیشان نے کہا "بہرحال جواد کی رہائی کے لئے کسی قسم کا رابطہ نہ کرنا، پیسوں کا ڈیمانڈ نہ کرنا، اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ جواد اسمگلروں، منشیات فروشوں کے پاس ہے اور وہ اسے جبراً اپنے کام کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔"

آغا عمران نے ذیشان کی ذہانت کی داد دیتے ہوئے اسے پیار کیا اور چند کاغذات، فائلیں سمیٹتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور اس سے پہلے کہ ذیشان ان سے کچھ پوچھتا وہ خود جیپ ڈرائیو کرتے ہوئے باہر نکل گئے۔

ذیشان نے اجلال کو پوری تفصیل بتائی اور اس سے کہنے لگا۔

"پولیس جواد کو تلاش نہیں کر سکتی لیکن میرا خیال ہے کہ اگر ہم دونوں کوشش کریں تو کام بن سکتا ہے۔"

"وہ کیسے۔؟ اجلال نے پوچھا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" ذیشان اجلال کو لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

رات کے نو بجے تھے۔ آغا عمران اور انسپکٹر شعیب کے ساتھ چند مسائل پر گفتگو کر رہے تھے کہ گھر سے فون آیا۔

"ذیشان اور اجلال دونوں گھر پر نہیں ہیں معلوم نہیں وہ کہاں چلے گئے ہیں۔"

جواد نے پرنس احسن پر اپنا اعتماد بحال کر لیا تھا۔ گزشتہ ایک ہفتے میں اس نے کئی ایک مشورے ایسے دیئے تھے جس سے پرنس احسن کو لاکھوں روپے کا فائدہ ہوا تھا۔ اس کا کوئی ٹرک، کوئی آدمی پکڑا نہیں گیا تھا۔ پرنس احسن نے ان پر سختی بھی کم دی تھی۔ اب وہ اپنے کمرے سے نکل کر محل کے دوسرے حصوں میں جا سکتے تھے، محل کے لان میں کھیل سکتے تھے اور اسی دن کے انتظار میں جواد پرنس احسن کے لئے کام کر رہا تھا۔ رات کے کھانے کے لئے جب ان کے کمرے کا دروازہ کھلا تو جواد طے شدہ پروگرام کے مطابق پہلے ہی سے دروازے کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ گڑیا بالکل سامنے کھڑی تھی۔ پری نما لڑکی کھانا لے کر آئی۔ اس نے کھانا میز پر رکھتے ہوئے گڑیا سے جواد کے بارے میں پوچھا اور اس سے پہلے کہ گڑیا کوئی جواب دیتی جواد نے ایک خوبصورت گلدان کا نقصان کر ڈالا۔ گلدان کی ضرب پڑتے ہی پری نما لڑکی چکرا کر گر پڑی۔ جواد نے فوراً دروازہ بند کر دیا۔ تھوڑی دیر انتظار کیا کہ شاید کوئی گلدان کی آواز سن کر آئے گا۔ جب کوئی نہ آیا تو ان دونوں نے لڑکی کو گھسیٹ کر کھلونوں کے ڈھیر میں چھپا دیا کہ اب کھلونوں کا ڈھیر پہلے سے ذرا بڑا لگ رہا تھا۔ اس کے بعد دونوں نے مل کر کھانا کھایا حالانکہ بھوک بالکل اڑ گئی تھی لیکن آنے والے وقت کا سوچ کر جواد نے زبردستی کھانا کھایا اور گڑیا کو بھی اصرار کر کے کھانا کھلایا۔ کھانا کھانے کے بعد انہوں نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئے۔ ایک ہفتہ میں انہوں نے محل سے باہر نکلنے کا خفیہ راستہ معلوم کر لیا تھا۔ دو تین راہداریوں کے بعد بڑے دروازے کے پاس پہنچے تو یکدم دو سیکورٹی گارڈ اسٹین گن ہاتھوں میں پکڑے سامنے آ گئے۔ پہلے تو دونوں گھبرائے پھر فوراً ہی انہوں نے اپنے حواس پر قابو پایا اور ایسے چلنے لگے جیسے سیر کر رہے ہوں۔

"تو سیر ہو رہی ہے۔" ایک گارڈ نے مشینی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"جی وہ رات کا کھانا کھایا تو سوچا تھوڑی چہل قدمی کر لی جائے۔"

"ٹھیک ہے لیکن باہر نہ جانا۔ اس وقت شکاری کتے کھول دیئے جاتے ہیں۔"

"نہیں، وہ تو ہم محل کے اندر ہی......"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" اور دونوں گارڈ

آگے بڑھ گئے۔

جواد نے سیکورٹی گارڈ کو عادی بنالیا تھا کہ وہ محل میں انہیں اس طرح گھومتے ہوئے دیکھ کر پریشان نہ ہوں لیکن وہ جو "خوشخبری" سنا گئے تھے اس پر جواد اور گڑیا کے پسینے چھوٹ گئے تھے۔

"بھیا...... میرے خیال میں واپس چلیں، اپنے کمرے میں"

"جی...... اور وہ جو کھلونوں کے ڈھیر میں بے ہوش پڑی ہے۔ ہو سکتا ہے مر بھی گئی ہو۔ اس کا کیا کریں گے۔ بس تم باہر نکلو۔"

"اور وہ کتے؟"

"اللہ مالک ہے۔" جواد نے گڑیا کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

دونوں نے ایک خاص مقام پر پہنچ کر اپنا راستہ تبدیل کیا اور اپنے طے شدہ خفیہ دروازے کا سہارا لے کر محل سے باہر نکل گئے۔ شکاری کتوں کے بھونکنے کی آوازیں دل دہلا رہی تھیں۔ گڑیا رونے لگی لیکن جواد نے اس کے رونے پر کوئی توجہ نہ دی اور اسے کھینچتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ جھاڑیوں میں ان کی سرسراہٹ سے ڈر کر ایک پرندہ زور سے چیخا اور پھر اڑ کر قریب ہی درخت پر بیٹھ گیا۔ پرندہ کی آواز سن کر کتوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ دونوں نے اور تیز بھاگنا شروع کر دیا۔ جھاڑیوں اور کانٹوں سے الجھ کر ان کے کپڑے پھٹ گئے تھے۔ بازوؤں اور ٹانگوں پر خراشوں سے خون رس رہا تھا۔ کتوں کی آوازیں کبھی بہت قریب ہو جاتیں اور کبھی بہت دور۔ اب کتوں کی آوازوں کے ساتھ آدمیوں کی آوازیں بھی شامل ہوگئیں تھیں۔ غالباً انہیں جواد اور گڑیا کے بھاگنے کا علم ہو گیا تھا اور وہ انہیں کسی بھی قیمت پر بھاگنے نہیں دینا چاہتے تھے۔ آخر تھک ہار کر گڑیا ایک جگہ گر پڑی۔ جواد میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اسے اٹھا کر چل سکے جواد نے فیصلہ کیا کہ وہ جنگل میں کہیں چھپ جائے اور رات وہیں گزار دے۔ اندھیرے میں کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ بس اندازے سے اس نے زمین کو ٹٹولا۔ ذرا سا زمین کو صاف کیا اور وہیں وہ دونوں لیٹ گئے۔ کتوں اور آدمیوں کی آوازیں آہستہ دور ہوگئیں۔ شاید وہ تھکاوٹ کی وجہ سے آوازیں سن نہیں پارہے تھے ان پر نیم بے ہوشی طاری تھی۔ جوں توں کرکے انہوں رات وہیں گزاری اور صبح سورج نکلنے سے پہلے ہی وہ پھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ جواد کا خیال تھا کہ اگر سورج نکل آیا تو وہ لوگ انہیں جنگل میں تلاش کر لیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ سورج نکلنے سے پہلے ہی جنگل سے باہر نکل جایا جائے۔

انہیں قریب ہی ایک طرف ٹریفک کا شور سنائی دیا۔ جواد نے رک کر سمت کا تعین کیا اور پھر وہ ایک طرف چل پڑے۔ گرتے پڑتے وہ کوئی ایک گھنٹے میں سڑک پر پہنچ گئے۔ جنگل کے ساتھ ساتھ ایک

پختہ سڑک چل رہی تھی۔وہ سڑک کے کنارے کھڑے ہو گئے۔ جواد سوچ رہا تھا کہ کسی بھی سمت کی کوئی سواری آئی تو وہ اسے لفٹ کے لئے کہے گا۔ اور وہ ڈر بھی رہا تھا کہ کہیں پرنس احسن کے آدمی ہی اسے سڑک پر نہ مل جائیں۔ اتنے میں ایک ٹرک آتا ہوا دکھائی دیا۔ جواد نے اسے اشارہ کیا اور وہ ٹرک ان کے پاس آکر رک گیا۔ اور اشارے سے ڈرائیور نے دونوں کو ٹرک میں اپنی سیٹ کے پاس بٹھالیا۔ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا ایک اور آدمی بغیر کچھ بولے چلتے ٹرک میں ٹرک کے اوپر چلا گیا۔

"کدھر جاؤ گے۔"

"بس آگے جو شہر آئے وہاں اتار دیجئے گا۔" آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ جواد نے کہا۔

"گھر سے بھاگ کر آئے ہو۔؟"

"نہیں ہمیں ڈاکوؤں نے اغوا کر لیا تھا۔ ان سے بھاگ کر آئے ہیں۔" جواد نے جان بوجھ کر پرنس احسن کا نام نہیں لیا تھا۔

ڈرائیور خاموشی سے انہیں دیکھتا رہا۔ اور پھر تھوڑے فاصلے پر جاکر اس نے اپنا ٹرک ایک چھپر ہوٹل کے پاس روک لیا۔ دونوں کو غصے سے دیکھا اور کہنے لگا۔

"نیچے مت اترنا۔ ورنہ پھر ڈاکو آجائے گا۔" اور پھر اپنے گندے گندے دانت نکال کر ہنسنے لگا۔ دونوں سہم کر ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھ گئے۔ ڈرائیور چھپر ہوٹل میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک اور آدمی اس کے ساتھ آیا اور غور سے جواد اور گڑیا کو دیکھنے لگا۔

"ٹھیک ہے۔" اس آدمی نے دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہاں سے آگے سات کلو میٹر جاکر ایک موڑ آئے گا۔ شیشے والا موڑ۔ وہاں ٹرک روک کر تین مرتبہ ہارن بجانا، ایک آدمی آئے گا اس کو ہمارا سلام بولنا اور ساتھ بولنا۔ "ایک ٹلوا، ایک ٹلوی۔" یہ ہمارا کوڈ ورڈ ہے۔ وہ سمجھ جائے گا۔ وہ مال لے لے گا اور پیسہ تم کو ادھر ہی دے گا۔"

ٹرک چلنے لگا تو اسی چھپر ہوٹل پر ایک بس آکر رکی۔ جواد نے دیکھا کہ بس کی کھڑکی کے پاس والی سیٹ پر ذیشان اور اجلال بیٹھے ہیں۔ ٹرک چل پڑا تو جواد چیخا "بس انکل! آپ ہمیں یہیں اتار دیں وہ بس میں ہمارے دوست ہیں۔ اب ہم گھر پہنچ جائیں گے وہ ...... اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتا یا ذیشان کو آواز دیتا، ڈرائیور نے ٹرک کی رفتار تیز کر دی اور پھر ایک ویران جگہ پر ٹرک روک کر دونوں کے ناک پر رومال رکھ کر انہیں بے ہوش کر دیا اور پھر انہیں اس سیٹ پر لٹا کر اوپر سے چادر ڈال دی۔ (جاری ہے)

چیزوں کی کہانی

الماریاں

آصف فرخی

چیزوں کی کہانی میں ایک اہم حصہ چیزوں کے رکھنے کا بھی ہے۔ جوں جوں انسان اپنی سہولت اور آرام کے لئے مختلف چیزیں بناتا گیا، چیزوں کو سنبھال کر رکھنے کی اہمیت بھی بڑھ گئی۔ چیزوں کی دریافت اور ایجاد کے ساتھ چیزوں کو رکھنے کے طریقے بھی دریافت ہوتے گئے۔

اگر چیزیں بکھری ہوئی ہوں اور بے ترتیب پڑی ہوں تو ہمیں بُرا لگتا ہے۔ ہم نے اپنی دانست میں ہر چیز کی ایک جگہ مقرر کی ہوئی ہے، اور استعمال کے بعد چیز کو اس کے طے کئے ہوئے مقام پر رکھ دیتے ہیں۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو اگلی دفعہ جب اس چیز سے کام پڑے تو بہت سا وقت اسے ڈھونڈنے میں صرف ہوگا۔ اور پھر ادھر ادھر بکھری ہوئی چیزیں، بھٹکتی پھرتی ہیں، اگر انہیں احتیاط سے نہ رکھا جائے تو خراب ہو جاتی ہیں، ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں۔ اور ٹوٹی پھوٹی چیزوں سے کام نہیں ہوتا، وہ بھلا کس

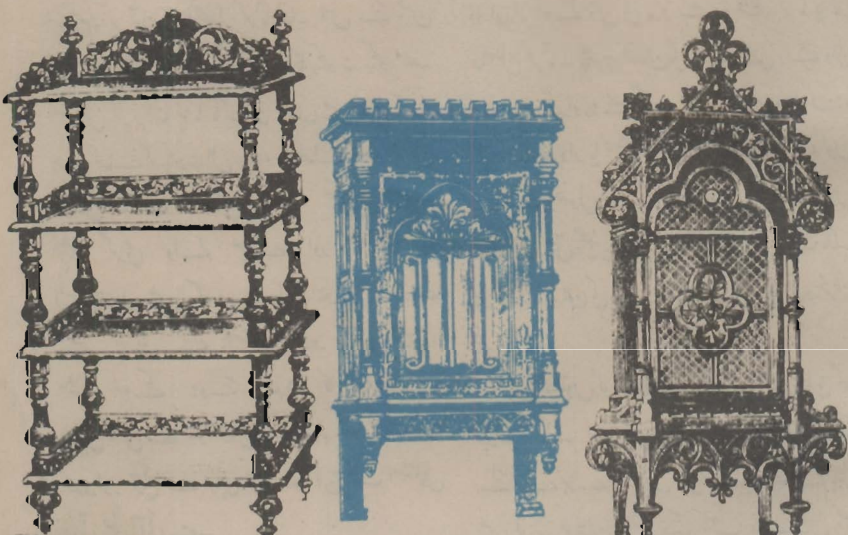

کام کی؟ چیزیں اس بات کی متقاضی ہیں کہ ان کا خیال رکھا جائے۔ بکھری ہوئی چیزیں جگہ بھی زیادہ گھیرتی ہیں۔ اگر انہیں سمیٹ لیا جائے تو کم جگہ میں زیادہ چیزیں سما سکتی ہیں، اور ترتیب سے گنجائش بڑھتی ہے۔ چیزوں کے استعمال میں آسانی ہو جاتی ہے۔ اس لئے چیزوں کو اس طرح رکھنے سے ہمارے لئے سہولت ہو جاتی ہے۔

چیزوں کو رکھنا ایک سہولت ہی نہیں بلکہ ضرورت بھی ہے۔ یہ ضرورت آج سے صدیوں پہلے کے انسان نے بڑی شدت کے ساتھ محسوس کی تھی۔

پرانے زمانے کے لوگوں کو چیزیں سنبھال کر رکھنے کی ضرورت اس لئے زیادہ پڑی کہ وہ غذا کی فراہمی کے لئے قدرت کے مظاہر، مثلاً موسم، پر تمام تر انحصار کرتا تھا۔ اس لئے جس زمانے میں غذا وافر ہوتی تو اس کا کچھ نہ کچھ حصہ سنبھال کر رکھنا پڑتا تاکہ ان دنوں میں کام آئے جب کھانے کو کچھ نہ مل رہا ہو۔ کھانے کی جو چیزیں آسانی سے رکھی جا سکتی تھیں، مثلاً گری والے میوے اور پھل، وہ ایسی چیزوں میں رکھ دیئے جاتے جو اس کام کے لئے آسانی سے استعمال ہو سکتی تھیں، مثلاً سوکھے ہوئے کدو کا چھلکا، یا ناریل جس سے گودا نکال لیا گیا ہو۔ سوکھے ہوئے کدو اور ترئی سے تونبی بنی، جو آج تک استعمال ہوتی چلی آئی ہے۔

درختوں کے سوکھے تنے یا کھوکھلے ٹھنٹھ اور بانس کے پودے بھی ان چیزوں کو رکھنے اور چھپانے میں کام آتے تھے۔

بانس، سرکنڈے اور نرکل نے ٹوکری کی شکل اختیار کر لی، اور کھانے پینے کی چیزیں ان میں رکھی جانے لگیں۔ جب برتن بننے لگے تو اس وقت تک انسان زمین کو کاشت کرنا اور فصلیں اگانا سیکھ گیا تھا۔ اب غذا کی فراہمی، موسم کی اس طرح سے پابند نہیں رہی کہ جیسی شکار کے زمانے میں تھی۔ مگر اگلے وقت کے لئے غذا فراہم کر کے رکھنا، انسان کی فطرت میں داخل ہو گیا۔ اور چیزوں کو رکھنے کی عادت پڑ گئی۔

رکھنے والی چیزوں کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ پہلے پہل ہر انسان کے پاس زیادہ سے زیادہ وہ اوزار ہوتے جن کی مدد سے وہ شکار کرتا یا غذا حاصل کرتا۔ پھر ہر انسان کی ملکیت میں رہنے والی چیزوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ خاص طور پر وہ لوگ جو قبیلے کے سردار یا بستی کے بادشاہ ہوتے، وہ لوگوں سے تحفے وصول کر کے یا جنگ میں ہارنے والوں سے زبردستی چھین کر بہت ساری چیزوں کے مالک ہو جاتے۔ ان کی اس دولت اور مال کا ذخیرہ خزانہ بن جاتا۔

ان خزانوں کو رکھنے کے لئے گودام اور اناج گھر بنوائے گئے۔ اناج کو چوہوں سے محفوظ رکھنے کے لئے بڑے بڑے مرتبانوں میں رکھا جاتا تھا قدیم بابل میں تو یہ مرتبان، شہر کے کتب خانے میں بھی

استعمال ہوتے۔ کتابیں اور شاہی فرمان، گول گول لپیٹ کر مرتبان میں رکھ دیئے جاتے۔ قدیم مصر کے دولت مند گھرانوں میں بھی اناج رکھنے کے لئے گودام ہوتا جہاں غذا کے برتن چھت سے لٹکا دیئے جاتے تاکہ چوہوں کی پہنچ سے دور رہیں۔ اناج کے برتنوں کو لبالب بھر کے، چکنی مٹی سے بند کر دیا جاتا اور ان کے اوپر لکھ دیا جاتا تاکہ بعد میں معلوم ہو سکے کہ ان کے اندر کیا ہے۔ اس طرح ایک فصل کی پیداوار اگلی فصل تک استعمال ہو سکتی تھی۔ پہننے کے کپڑے اس طرح رکھے جاتے تھے کہ دھوپ اور ہوا لگتی رہے، اور انہیں تہہ کر کے سرکنڈے کی بنی ہوئی پٹاریوں میں رکھا جاتا۔ باقی کپڑے، دیوار میں بنی ہوئی الماری میں رکھے جاتے۔

مصر، یونان اور روم میں زیورات اور آرائش کی چیزیں بہت قیمتی ہوتی تھیں، اور ان کو احتیاط سے رکھنا ضروری تھا۔ خواتین اپنے زیور اور سنگھار کی چیزیں خوب صورت اور نازک ڈبوں میں رکھتی تھیں۔ یہ ڈبے بھی بڑی کاری گری اور مہارت سے بنائے جاتے۔ چیز کے ساتھ ساتھ اس کے رکھنے والی چیز کی اہمیت بھی لوگوں نے محسوس کر لی تھی۔

کپڑے رکھنے کے لئے قدیم مصر میں فرعونوں کے زمانے سے ہی لکڑی کے صندوق استعمال ہونے لگے تھے۔ البتہ قدیم یونان میں کپڑے ٹانگنے کے لئے دیوار پر بنی ہوئی کھونٹیوں سے کام لیا جاتا تھا۔ پرانی قوموں میں سے غالباً روم کے لوگوں نے سب سے پہلے الماری بنائی۔ روم کی الماریوں میں پٹ لگے ہوئے ہوتے تھے۔ اور وہ پایوں پر کھڑی ہوتی تھیں۔

مگر یہ الماری بھی سب کو کہاں میسر تھیں! زیادہ تر گھروں میں یہ ہوتا تھا کہ دیوار میں ایک طاق ہوتا جس میں چیزیں رکھی جاتی تھیں۔ صرف بہت امیر لوگ ہی الماری یا صندوق رکھ سکتے تھے۔ اور چوں کہ زیادہ ساز و سامان کا رواج نہیں تھا، اس لئے اس صندوق پر بیٹھا بھی جاتا، اور اس پر کھانا چن کر میز کا کام بھی لیا جاتا۔

کتابیں بھی ان ہی صندوقوں میں رکھی جاتی تھیں۔ ازمنۂ وسطیٰ کے راہب اور علماء کتابوں کو دیوار میں بنی شیلف پر رکھنے لگے تاکہ کتابیں آسانی سے رکھی اور ضرورت کے وقت نکالی جا سکیں۔ اس سے پہلے شیلف کا زیادہ رواج نہیں تھا۔ مگر پھر امراء اپنے گھروں میں چاندی کے ظروف شیلف پر رکھنے لگے۔ تاکہ ہر آنے جانے والا انہیں دیکھے اور شیلف پر سجا کر وہ اپنی دولت اور مال و زر کی نمائش کرنے لگے۔

چاندی کے برتنوں سے سجا ہوا شیلف سترھویں صدی کے یوروپ میں دولت اور سماجی مرتبے کی نشانی بن گیا۔ الماری کو بھی ایسی ہی علامت سمجھا جاتا تھا۔ الماری کا وزن اور اس کا حجم، الماری کے مالک کی دولت اور مرتبے کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ یعنی بڑا آدمی وہ ہوا جس کی الماری بڑی ہے۔

مسلمان بادشاہوں کے عہد کے برصغیر میں محلوں کے اندر جس جگہ کپڑے اور لباس رکھے جاتے تھے، اس جگہ کو جامہ خانہ یا توشک خانہ کہتے تھے۔ زیادہ تر سامان صندوق میں رکھ کر بند کر دیا جاتا۔ صندوق عموماً لکڑی کے ہوتے، لیکن شاہی محل میں سنگ مرمر اور آبنوس کے صندوق بھی ہوتے تھے۔

تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ تیمور کے پاس سونے کا ایک صندوق تھا۔ اس کا ڈھکنا، بہت چوڑا تھا۔ صندوق کے اوپر نیلے اور ہرے شیشے اور دھات کے چھوٹے چھوٹے برج بنے ہوئے تھے۔ جس میں ہیرے اور قیمتی جواہر جڑے ہوئے تھے۔ صندوق کھولا جاتا تو اس کے اندر اونچی جگہ پر پیالے نظر آتے تھے۔ پیالیوں کے اوپر سونے کے چھ بڑے گنبد نظر آتے ان میں بھی ہیرے جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ بادشاہ کا یہ صندوق، عجائبات کا صندوق ہوگا!

آج کل ہم بڑے بڑے صندوقوں کی جگہ دھات کے بکس استعمال کرتے ہیں۔ لکڑی کی الماریوں کے ساتھ ساتھ اسٹین لیس اسٹیل کی الماریاں بھی خوب استعمال ہوتی ہیں، کیوں کہ یہ مضبوط اور پائیدار ہوتی ہیں۔

جس زمانے میں کتابیں، مسودوں کی شکل میں مرتبان میں رکھی جاتی تھیں، وہ کب کا گزر گیا۔ آج کل کتاب کو بک شیلف یا بک ریک، میں رکھا جاتا ہے۔ کاغذات ساتھ رکھنے کے لئے بریف کیس موجود ہیں، جن کی وجہ سے کاغذات لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں سہولت ہو گئی ہے۔ ایسے ہی بیگ اور کیس لے کر لوگ سفر پر بھی نکلتے ہیں، کیوں کہ ریل اور ہوائی جہاز کے سفر کے لئے یہ زیادہ مناسب ہیں۔

اور رہ گئیں کھانے پینے کی چیزیں تو پہلے انہیں چھینکے میں لٹکایا جاتا یا نعمت خانے میں رکھا جاتا تھا۔ جو چیزیں جلدی خراب ہو جانے والی ہوتی ہیں، ان کا یا تو مربہ بنالیتے، یا دھواں دے لیتے، یا سکھا کر رکھ لیتے۔ امریکہ کے سرخ ہندی باشندے ایسی چیزوں کو غاروں میں یا زمین سے نکلنے والے ٹھنڈے چشموں میں رکھ دیتے۔ بعض مرتبہ ایسی چیزوں کو برف پر بھی رکھ دیا جاتا۔

پھر رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ سردی اور برف باری کے بعد جم کر برف بن جانے والی جھیلوں میں سے یخ بستہ پانی کے بڑے بڑے ٹکڑے توڑ لئے جاتے اور برف خانوں میں محفوظ رکھے جاتے۔ برف کے یہ ٹکڑے پانی کو ٹھنڈا اور کھانے پینے کی چیزوں کو کئی دن تک محفوظ رکھنے کے لئے اتنے مفید ثابت ہوئے کہ ان کا کاروبار ہونے لگا۔ برف کو ڈبوں میں ڈال کر ان میں کھانا رکھا جاتا۔ کھانے کو ٹھنڈا کرنے والا یہ ڈبا، یا "ٹھنڈی الماری" دراصل ریفریجریٹر کی ابتدائی شکل ہے۔ فرج اور ڈیپ فریزر نے کھانے کی چیزیں محفوظ رکھنے کو بہت آسان بنا دیا ہے۔

مصنف ماسافومی ناکاگاوا

مترجم: جونکو واتاسے

اس جاپانی کہانی کا اردو ترجمہ ایک جاپانی طالب علم نے کیا ہے۔

چاندنی رات میں خدا حافظ

ابا اس رات بھی مچھلی پکڑنے کے لئے جھیل پر گئے ہوئے تھے۔ مچھلی پکڑنا ابا کا کام تھا۔ تارو گھر پر اکیلا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ باہر سے کھٹ کھٹ کی آواز آرہی ہے۔

"کون آیا؟ ہوا کی آواز؟" تارو نے دروازے کو کھول کر باہر دیکھا۔ چمکیلے چاند کی رات تھی۔ غور سے دیکھنے پر وہ سمجھ گیا کہ منجمد چاندنی میں دو سیاہ سائے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

"واہ! تم۔۔ریچھنی ہو!" تارو حیران ہوگیا۔ اس نے سوچا کہ اتنی رات گئے ریچھنی میرے گھر کیوں آئی ہے؟ اس نے کہا "ابا تو ابھی گھر پر نہیں ہیں۔ اگر ان سے کوئی کام ہے تو پھر کل آؤ"۔

مگر ریچھنی نے "نہیں" کے انداز میں اپنا سر ہلایا اور دونوں ریچھ سر جھکا کر سلام کرتے ہوئے چلے گئے۔ تارو نے سوچا، "عجیب ریچھ ہیں۔" ریچھ مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتے جھیل کی طرف جا رہے تھے۔ ان کو دیکھتے دیکھتے تارو کو خیال آیا۔ "یہ وہی ریچھنی ہے! یقیناً!" تارو کو یاد آیا کہ اس نے اس ریچھنی کو پہلے بھی دیکھا ہے۔

پچھلے سال گرمیوں کی بات تھی۔ بہت گرم دن تھا اور دوپہر کے بعد جب آج ہی کی طرح تارو گھر پہ اکیلا تھا تو باغ میں جہاں آلو بخارے سکھائے جا رہے تھے کوئی بیٹھا ہوا تھا۔ "یہ کون بڑھیا بیٹھی ہے؟" تارو نے یہ سوچتے ہوئے اس کو آواز دی۔ "اتنی تیز دھوپ میں آپ کیا کر رہی ہیں؟" تارو کی آواز پر اس نے جب مڑ کر دیکھا تب تارو کو یہ پتا چلا کہ وہ ریچھنی ہے۔ ریچھنی گبر گبر آلو بخارے کھا رہی تھی اور اس کا منہ اور دانت لال لال ہو رہے تھے۔ تارو نے حیران ہو کر کہا۔ "تم اتنی کھٹی چیز کیسے کھا سکتی ہو!" اس نے سوچا کہ شاید اس ریچھنی کو سخت بھوک لگ رہی ہے اور کہا، "اچھا خیر، گھر پہ ابا اور میں، صرف دو لوگ ہیں۔ اگر تم پیٹ بھر کے بھی کھاؤ تو کوئی بات نہیں۔"

اس نے محسوس کیا کہ کھاتے کھاتے ریچھنی کا پیٹ بھر گیا۔ پھر ریچھنی اپنا منہ پونچھتے اور اپنا بدن ہلاتے ہوئے آہستہ آہستہ باغ کے باہر چلی گئی۔ تارو نے سوچا کہ یہ ریچھنی شاید بیمار ہے۔ اس کے قدم کچھ سست پڑ رہے تھے۔

ریچھنی کے جاتے ہی گاؤں کے لوگ دوڑتے ہوئے آئے اور کہنے لگے؟ "تارو! ادھر ایک ریچھنی گھوم رہی تھی نا؟"

"جی، تھوڑی دیر پہلے یہاں بیٹھی ہوئی تھی۔"

"اچھا اور کس طرف چلی گئی؟"

"ادھر!" یہ کہتے ہوئے تارو نے اس کی مخالف سمت میں، جس طرف ریچھنی تھی، انگلی سے اشارہ کر دیا۔

"ہاں...... وہ یقیناً وہی ریچھنی ہے!" تارو کو اس دن کی یاد صاف صاف آ رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ شاید اس وقت اس کے پیٹ میں بچہ تھا۔ اسی لئے وہ آلو بخارے جلدی جلدی کھا رہی تھی۔ "ہاں! وہ بچہ پیدا ہو گیا تھا اور اب چل بھی سکتا ہے۔"

"اچھا، وہ اسی بچے کو مجھے، دکھانے کے لئے میرے گھر آئی تھی! مجھے بچے کا چہرہ اچھی طرح دیکھ لینا چاہئے تھا۔ فوراً ان کے پیچھے بھاگا مگر باہر صرف چاند کی چمکیلی روشنی تھی۔ ریچھنی اور اس کا بچہ کہیں نظر نہ آئے۔

اس رات تھوڑی دیر میں موسم بدل گیا اور چاروں طرف کہر پڑنے سے دیکھنا بھی مشکل ہو گیا۔ اگلی صبح اور زیادہ دھند چھائی ہوئی تھی۔ صبح کو ابا جھیل سے واپس آئے۔ ان کا بدن کہر سے گیلا ہو گیا تھا۔ "تارو! تارو!" پکارتے ہوئے معمول کے خلاف ابا نے سوئے ہوئے تارو کو جگایا اور کہا، "آنکھیں کھولو اور اچھی طرح سنو، کل رات میں نے ایک بہت عجیب چیز دیکھی۔" ابا کی کہانی یہ ہے۔

جب وہ اکیلے جھیل کے بیچ میں جال ڈال رہے تھے تو پانی میں خچر خچر کی حیران کن آواز آئی۔"کتنا عجیب آدمی ہے! ایسی سرد رات میں کیا کر رہا ہے؟" اُس نے لالٹین اُٹھا کر آواز کی طرف دیکھا۔ "کیا بات ہے!" ایک ریچھنی اپنے بچے کے ساتھ جھیل میں پیرتی ہوئی آرہی تھی۔ تارو کے ابا نے حیران ہو کر کہا، "تم لوگ کتنی خطرناک حرکت کر رہے ہو!" مگر جب غور کیا تو پھر یہ بات سمجھ میں آئی۔ ادھر پہاڑ میں اس سال پھل بہت کم آئے ہیں۔ اس لئے شاید ان کے کھانے کا سامان اس طرف نہیں رہا۔ تارو کے ابا نے کہا، "اس لئے وہاں جھیل کے دوسرے کنارے پر، جہاں پھل زیادہ ہیں، وہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر پیرتے ہوئے جا رہے تھے۔"

"تارو نے سوچا، "یہی بات تھی کہ کل رات وہ ریچھنی اپنے بچے کے ساتھ میرے پاس......" وہ زور سے "آہا!" کہنے والا تھا مگر خاموش رہا۔ پھر آہستہ سے بولا، "تو خدا حافظ کہنے کے لئے آئی تھی......"

"کیا؟ خدا حافظ؟" ابا نے تعجب سے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔" کہہ کر تارو نے دل میں یہ قطعی فیصلہ کیا کہ کل رات کی بات کسی سے بھی نہ بتاؤں گا اور اپنے ہی دل میں رکھوں گا۔

خالی جگہ

قائد اعظم ایک دفعہ ایک مقدمہ لڑ رہے تھے۔ انگریز جج ان سے جھینپا ہوا تھا۔ اس نے چل کر قائد اعظم کو مخاطب کیا۔ "مسٹر جناح! میں آپ کی بات ایک کان سے سن کر دوسری کان سے نکال رہا ہوں۔" قائد اعظم نے برجستہ جواب دیا۔ "غالباً آپ کے دونوں کانوں کے درمیان کی جگہ خالی ہے۔"

پگلی

عبداللہ شیخ گوہر

ایک چینی کہانی جو آپ کے اپنے ملک کی بھی ہے

بیجنگ کا پر رونق بازار آج اپنے عروج پر تھا۔ ہر طرف سے دکانداروں کی نت نئی بولیاں سنائی دیتی تھیں۔ ماحول میں اتنا شور و غوغا برپا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ پنگ لی بازار کے چوک پر کھڑی تھی۔ اس کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ تھی۔ پنگ لی ہر آنے جانے والے کو غور سے دیکھتی مگر جب چانگ شن کا چہرہ اس کو کہیں نظر نہ آتا تو اس کا چہرہ مرجھا جاتا ہے چانگ شن اس کا اکلوتا ہی تو بیٹا تھا۔ وہ اپنے گمشدہ بیٹے کو ایک ڈیڑھ سال سے مسلسل تلاش کر رہی تھی۔ مگر قسمت کو شاید اس کی ممتا کا مزید امتحان منظور تھا۔ بیٹے کی یاد آتے ہی اس کی ضعیف العمر آنکھوں میں آنسو بھر

آئے۔

بازار میں گہما گہمی تھی۔ صبح کے گیارہ بج چکے تھے۔ ٹریفک کے بدبو دار اور آلودہ دھوئیں نے صبح کی تازہ ہوا کو کب کا رفوچکر کر دیا تھا۔ بیجنگ کے اسی پر رونق بازار میں اس کا بیٹا چانگ شن اس سے بچھڑ گیا تھا۔ "نہ جانے اب وہ کہاں اور کس حال میں ہوگا۔" پنگ لی سوچنے لگی۔ اس کی متلاشی نظریں مسافر بسوں میں بھی جھانکنے لگیں۔ اچانک اس کی نظریں ایک چہرے پر آکر رک گئیں۔ وہ ہوبہو اس کا بیٹا چانگ تھا جو ایک مسافر بس کے قریب کھڑا تھا۔ خوشی سے اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔

"چانگ میرے بیٹے" پنگ لی اس کی طرف بڑھنے لگی۔ اچانک وہ لڑکا پنگ لی کی بے چین ممتا سے بے خبر تیزی سے بس میں سوار ہوگیا۔ پنگ لی بیٹے کو چھوڑنے کے لئے کسی طور بھی تیار نہ تھی اگر یہ موقع اس کے ہاتھ سے نکل جاتا تو شاید ہی وہ پھر بیٹے سے مل پاتی۔ وقت کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے وہ تیزی سے چلتی ہوئی بس میں سوار ہوگئی۔ بس مسافروں سے بھری ہوئی تھی۔ اس کا چانگ آخری تیسری نشست پر بیٹھا ہوا کھڑکی میں سے جھانک رہا تھا۔ پنگ لی بھی ڈرائیور کی قریب والی نشست پر بیٹھ گئی۔ وہ بیٹے سے ملنے کے لئے بے قرار تھی۔ اس نے چانگ کی طرف دیکھا۔ اس کے معصوم چہرے پر مسکراہٹ کھلکھلا رہی تھی۔ اس کے مسکرانے کا انداز بالکل چانگ جیسا تھا اب تو پنگ لی کو پورا یقین ہوگیا کہ وہ اس کا بیٹا چانگ ہی ہے۔ کنڈیکٹر کو کرایہ دے کر وہ ایک بار پھر چانگ کی طرف دیکھنے لگی۔ اچانک بس ایک اسٹاپ پر رکی۔ پنگ لی کی نظروں کے سامنے وہ اسٹاپ پر اتر گیا۔ اس نے بھی تاخیر کرنا مناسب نہ سمجھا اور کنڈیکٹر کو ہاتھ کا اشارہ کرتی ہوئی بس سے اتر گئی۔ وہ ایک گلی میں داخل ہورہا تھا۔ پنگ لی نے بھی تیز قدم بڑھائے اور اس کے پیچھے ہی گلی میں داخل ہوگئی۔ اس کو بیٹے کی بے رخی پر غصہ آنے لگا۔ وہ اپنی ماں سے دور نہ جانے کہاں جارہا تھا۔ اب تو پنگ لی کی بھی برداشت جواب دے چکی تھی۔ اس کے قدم مزید تیز چلنے سے قاصر تھے۔ چانگ اس سے کچھ فاصلے پر تھا۔

پنگ لی چیخ اٹھی۔

"بیٹا...... رک جاؤ۔" وہ رک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"بیٹا اس طرح کیا دیکھ رہے ہو...... میں تمہاری ماں ہوں۔ تم جب سے مجھ سے بچھڑے تھے۔ میں اس وقت سے تڑپ رہی ہوں۔ میں نے تمہیں شہر کے کس کس کونے میں تلاش نہ کیا۔" پنگ لی نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "آؤ چانگ میرے ساتھ گھر چلو...... وہاں کی ہر چیز تمہاری منتظر ہے۔"

چانگ نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"کیا بکتی ہو بڑھیا...... میں تم جیسی بردہ فروش عورتوں کو خوب اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم جیسی

عورتیں نہ ممتا کے جذبات رکھتی ہیں اور نہ تمہارا کوئی بیٹا ہوتا ہے، تم ہی ان ظالم اور سفاک عورتوں میں سے ہو جو معصوم بچوں کو اپنے چکروں میں پھنسا کر لے جاتی ہیں اور صرف کچھ پیسوں کے عوض ان معصوم بچوں کو بیچ دیتی ہیں مگر یاد رکھو میں تمہارے چکر میں آنے والا نہیں۔" اس کی آنکھوں سے نفرت جھلک رہی تھی۔

"تم جیسی عورتیں اس معاشرے کی ناسور ہیں..... اگر میرا بس چلے تو میں تمہیں اسی وقت ختم کر دوں..... مگر نہیں میں ایسا نہیں کروں گا..... خیر آج کے بعد تم یہ دھندہ نہ کر سکو گی....."

"پولیس..... پولیس....." اس نے سڑک پر کھڑے ہوئے پولیس مین کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔

پنگ لی جیسے بکھری گئی..... وہ ہرگز اس کا بیٹا نہ تھا۔ اس کا چانگ شن تو بولنا ہی نہ جانتا تھا۔ وہ پیدائشی گونگا جو تھا۔

توجہ فرمائیں

پرائز آف پوزیشن کے سلسلے میں درج ذیل بچوں کی سندیں بالکل تیار ہیں لیکن ان کے مکمل ایڈریس موجود نہیں۔ ان بچوں سے گزارش ہے کہ جلد از جلد اپنے گھر کا مکمل پتا بھیج دیں تاکہ سندیں روانہ کی جاسکیں۔

طاہر ملک، کراچی۔ ثمینہ بشیر رحیم یار خان۔ حنا مہ جبین، اسلام آباد۔ محمد ارشاد، سانگھڑ۔ محمد آصف ڈار، گجرات۔ افشاں اکرم، دستگیر کراچی۔ صائمہ عنبرین، ایبٹ آباد۔

(ادارہ)

کوئیز کہانی قسط نمبر۔ ۶ کے درست جوابات

۱۔ ۱۸۴۶ء میں کشمیر کو مہاراجہ بلدیپ سنگھ نے نہیں بلکہ گلاب سنگھ نے انگریزوں سے خریدا تھا۔

۲۔ کشمیر پر ڈوگرہ راج دو سو سال نہیں ایک سو سال تک رہا۔

۳۔ سرینگر میں شیخ فیض اللہ اور چوہدری اختر عباس نہیں بلکہ شیخ عبداللہ اور چوہدری غلام عباس کی تنظیموں نے ۱۹۲۶ء میں آزادی کی تحریک کو جنم دیا۔

۴۔ ۱۹۳۱ء میں چمپورام نے نہیں بلکہ ڈوگرہ کانسٹیبل لبورام نے قرآن مجید کی بے حرمتی کی جس پر پورا کشمیر سراپا احتجاج بن گیا۔

۵۔ قیامِ پاکستان کے ساتھ کشمیر میں شروع ہونے والی جنگِ آزادی ۱۹۵۰ء میں نہیں یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو بند ہوئی۔

۶۔ مقبوضہ کشمیر کا صدر مقام اننت نگر نہیں سرینگر ہے۔

۷۔ صوبہ آسام بھارت کے مشرقی پنجاب سے متعلق نہیں ہے بلکہ مشرقی جنوب کا علاقہ ہے۔

۸۔ تامل بھارتی پنجاب میں نہیں بلکہ تامل ناڈو کی تحریکیں بھارت کے اس حصے کی ہیں جو سری لنکا کی طرف واقع ہے۔

۹۔ سکھوں کی تحریک راجستھان کی نہیں مشرقی پنجاب کی ہے۔

۱۰۔ حضرت اسماعیل شہید اور حضرت سید احمد شہید کے مزار مظفر آباد میں نہیں بالا کوٹ میں ہیں جو ضلع ہزارہ پاکستان میں واقع ہے۔

اعلان

بچوں کے رسائل میں، اچھوتے، انوکھے اور حد درجہ دلچسپ کوئز کے سلسلے متعارف کرانے کا سہرا آنکھ مچولی کے سر ہے۔ ہمیشہ سے ہماری کوشش رہی ہے کہ بالکل منفرد انداز کے اور نت نئے سلسلے قارئین کی خدمت میں پیش کئے جائیں۔ کوئز کہانی بھی ایک ایسا ہی سلسلہ تھا جسے قارئین کی اکثریت نے بے حد پسند کیا...... لیکن یہ بھی آنکھ مچولی کی روایت رہی ہے کہ ہم کوئی بھی سلسلہ بہت زیادہ عرصے تک نہیں چلاتے، بلکہ ایک خاص مدت کے بعد نیا اور پہلے سے بہتر سلسلہ لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ کوئز کہانی اس ماہ سے اختتام پذیر ہوئی۔ نیا کوئز انشاء اللہ بہت جلد شروع کر دیا جائے گا۔ (ادارہ)

کشمیر معمہ...... انعام کس نے جیتا!

○ ...... یہ ایک ریکارڈ مقابلہ تھا۔
○ ...... آنکھ مچولی کی تاریخ میں آج تک کسی مقابلے نے اتنی مقبولیت حاصل نہیں کی۔
○ ...... بلا مبالغہ ہزاروں بچوں نے کشمیر معمہ حل کر کے بھیجا۔
○ ...... اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس میں ڈیڑھ ہزار بچوں کے حل درست نکلے تھے۔ اور انعامات تھے صرف تین۔
○ ...... اعلان کردہ طریقۂ کار کے مطابق قرعہ اندازی سے تین صحیح حل بھیجنے والوں کے نام نکالے گئے...... ان خوش نصیبوں کے نام یہ ہیں:

۱۔ سید حسن بلال علی ...... حیدر آباد (سندھ)
۲۔ ناصر محمود ...... لسبیلہ (بلوچستان)
۳۔ سید فاروق حسنی ...... لاہور

○ ...... ہم ان تینوں ساتھیوں کو مبارکباد پیش کرتے ہیں ان کے انعامات جلد ہی ان کے پتے پر روانہ کر دیئے جائیں گے۔
○ ...... ساتھ ہی ہم ان ذہین ساتھیوں سے معذرت خواہ ہیں جن کے درست جوابات کے باوجود ہم ان کے نام شائع کرنے سے معذور ہیں۔ کیونکہ اگر ان کے نام شائع کئے جائیں تو آدھے رسالے میں کچھ اور نہیں چھپ سکے گا۔ ان دوستوں سے تو ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ اے دوست زندہ محبت باقی!

قارئینِ آنکھ مچولی کا فیصلہ

جولائی کے شمارے میں قارئینِ آنکھ مچولی سے ایک سروے "میں اگر وزیر اعظم ہوتا؟" کیا گیا تھا اور اس کے بہترین جوابات مکمل کرنے کی ذمہ داری بھی قارئین کے سپرد کر دی گئی تھی۔ قارئینِ آنکھ مچولی کی اکثریت نے جن جوابات کو اول، دوئم اور سوئم قرار دیا ہے، وہ درج ذیل ہیں:

اول............ "اگر میں پاکستان کا وزیر اعظم ہوتا تو سب سے پہلے جہاد کا اعلان کرتا کیوں کہ کشمیر کی آزادی اقوام متحدہ کی قرار دادوں کے ذریعے نہیں بلکہ بزورِ شمشیر ہی حاصل کی جا سکتی ہے"۔
محمد کامران جیلانی۔ محلہ آباد، فیصل آباد۔ اللہ دتہ شہزاد۔ ہارون آباد، ضلع بہاول

نگر۔ عمران سہیل بوبی۔ سندھو کالونی، او کاڑہ۔ شاہ نواز گل برکی، شہریار گل برکی - پشاور۔ اسرار راؤ راجپوت۔ حالی روڈ، حیدر آباد۔ راشد محمود۔ آفیسرز کالونی، گارڈن کراچی۔ آصف حسن۔ تین ہٹی، کراچی۔ شاہدہ ادریس۔ مین بازار، ضلع بہاول نگر۔

دوم .... "بحیثیت وزیرِ اعظم پاکستان کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی پر پورے عالمِ اسلام کو نہ صرف آگاہ کریں گے بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کو متحد کر کے کشمیر کے جیالے مجاہدین کی اخلاقی، سیاسی، مالی اور فوجی امداد کریں گے"۔

صبا ارم۔ چوک اردو بازار، لاہور۔ یاسمین رحمت۔ ساہیوال۔ نسیم اختر۔ فرید ٹاؤن، ضلع ساہیوال۔ صائمہ خواجہ۔ اچھرہ لاہور۔ فہمینہ برڑو۔ ٹھٹھہ، سندھ۔ عنبرین ثاقب حسین۔ پی آئی بی کالونی، کراچی۔

سوم .... "اگر میں پاکستان کا وزیرِ اعظم بن گیا تو کشمیر کی آزادی کے لئے خود محاذِ جنگ پر جا کر لڑوں گا جہاد کا عام اعلان کروں گا یا پھر کفار سے لڑتا ہوا شہید ہو جاؤں گا"۔

اشفاق احمد ناز۔ مہاجر کیمپ، بلدیہ ٹاؤن۔ عائشہ ہمدم۔ فیڈرل بی ایریا، کراچی۔ سمیع اللہ، بنوں سٹی۔ تہمینہ خواجہ، اچھرہ، لاہور۔ محمد جاوید، ضلع اٹک۔

ادارہ انعام یافتگان کو مبارک باد پیش کرتا ہے اور انعام یافتہ ساتھیوں سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اپنے مکمل پتے جلد از جلد ہمیں بھیج دیں تاکہ انعامات روانہ کیے جاسکیں۔

قرعہ اندازی کے ذریعے انعامات حاصل کرنے والے خوش نصیب ساتھی:

۱۔ سید زاہد شیرازی، ضلع بھکر ۲۔ اظہر شبیر عابد، ضلع بھکر

۳۔ سید امجد علی زیدی، جھنگ صدر

تمام درست جوابات بھیجنے والے ساتھیوں کے نام:

راؤ عابد علی، پرنس بلال لودھی، سید خرم شیرازی، بھکر۔ شمائلہ وقار، راولپنڈی۔ سنبل گل گلزار علی، کراچی۔ سید شاہد حسین۔ راولپنڈی۔ سید انیس الحسن رضوی، ضلع بھکر۔ ثمینہ رضوان، رضوان الحق، صنوبر سلطانہ، عمران خان نیازی، کراچی۔

ایک غلط جواب بھیجنے والے ساتھیوں کے نام:

منہاج احمد خان، کراچی۔ تابندہ ریاض، لاہور۔ محمد عارف ایاز، حیدر آباد۔ ناہید اختر، لاہور۔ حافظ زبیر ظہور، حیدر آباد۔ نیلو فر قندیل، کمالیہ۔ صائمہ دلدار، فیصل آباد۔

ایک باغی کم ہو جائے گا

ایک واقعہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ ۲۱ جنوری ۱۹۹۰ء کے سانحہ میں ایک شخص معجزانہ طور پر زندہ بچ گیا۔ اس نے بتایا کہ بھارتی فوجی چند اور لوگوں کے ساتھ اسے بھی ایک پل پر لے گئے تھے جہاں پر انہیں گولی مارنی تھی۔ ایک فوجی نے طنزیہ لہجے میں اس سے سوال کیا "اسلام چاہتے ہو؟" اس شخص کے سامنے باقی لڑکوں کو گولی مار دی گئی۔ ایک لڑکا پل کے پیچھے چھپ گیا تھا انہوں نے اس کو وہاں سے کھینچ کر نکالا اور گولی مار دی۔ اس شخص کے زندہ بچ جانے کا سبب یہ تھا کہ جو فوجی اس کو گولی مارنے والا تھا اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ میں اس شخص پر زیادہ گولیاں خرچ کرنا نہیں چاہتا کہ یہ خود ہی مرنے والا ہے۔

مقبوضہ کشمیر میں مریضوں کو علاج معالجہ کرانے سے بھی روکا جاتا ہے۔ ایک خاتون اپنے بیمار بچے کو لے کر اسپتال جارہی تھی تو ایک بھارتی فوجی نے اسے روک کر کہا، :۔

"اسے مرجانے دو۔ اس طرح ایک باغی کم ہوجائے گا۔"

مرسلہ: قرۃ العین فخر

کامیابی مبارک

اپنی کامیابی سے

ہمیں بھی باخبر کیجئے

آپ کسی بھی کلاس
کے طالب علم ہوں ... اگر آپ نے کلاس میں
پہلی پوزیشن
دوسری پوزیشن
یا
تیسری پوزیشن
حاصل کی ہے تو اس کی تصدیق اپنے تعلیمی ادارے کے سربراہ سے کروائیے اور ہمیں بھجوا دیجئے؛
ہم آپ کو

پرائڈ آف پوزیشن

کی سند دیں گے

تحریکِ فروغِ علم میں پیش پیش

ماہنامہ
آنکھ مچولی
1- پی آئی بی کالونی، کراچی ۵

بے زبان کتاب

تحریر: ہانز کرسچین اینڈرسن ، ترجمہ: مجیب ظفر انوار

مترجم نے پڑھنے والوں کی سہولت کے لئے کرداروں کے نام بدل دیئے ہیں

لمبی چوڑی سڑک کے کنارے وہ ایک ہی لکڑی کا مکان تھا۔ سڑک اس پر اسرار مکان کے احاطے میں سے گزرتی تھی۔ جب صبح سویرے سورج نکلتا اور دنیا میں حیات افزا کرنیں بکھیرتا تو اس لکڑی کے مکان کی تمام کھڑکیاں کھل جاتیں۔ گھر کے تمام افراد بہت مصروف ہو جاتے۔ لیکن ان مکینوں میں ایک شخصیت ایسی بھی تھی جسے اس ابھرتے ہوئے سورج اور دنیا کی دلکشی سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور وہ شخصیت تھی پروفیسر انصاری کی۔

پروفیسر انصاری کو اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ کب صبح ہوئی، کب شام ہوئی اور کب رات کے اندھیارے پھیلنا شروع ہوئے۔ پروفیسر انصاری کی اپنی ایک الگ دنیا تھی۔ وہ ایک عظیم عالم تھے اور کئی مردہ زبانوں کے ماہر بھی تھے۔ یعنی وہ قدیم زبانیں جو اَب دنیا سے ختم ہو چکی تھیں۔ پروفیسر ان زبانوں کو بول سکتے تھے۔ ان کا حلقۂ احباب بھی بالکل محدود تھا۔ حتیٰ کہ ان کے زمانۂ طالب علمی کے دوست بھی ان سے ملنے سے

کتراتے تھے۔ بقول پروفیسر ضیاء کے! "مطالعے کے دوران شاید انصاری کا دماغ کسی کتاب ہی میں رہ گیا ہے۔" پروفیسر ضیاء کی اس پھبتی پر دوسرے لوگ خوب قہقہے لگاتے۔ اور یہ بات سو فیصد درست بھی تھی۔ پروفیسر انصاری ایک بہت بڑے ماہر لسانیات اور عالم تھے۔ بھیڑ بھاڑ سے بہت گھبراتے، اور یہ مکان بھی انہوں نے آبادی سے دور، شہر کے ہنگاموں سے بچنے کی خاطر بنوایا تھا۔ یہاں وہ اپنے مخصوص کمرے میں کتابوں اور پھولوں میں گھرے رہتے۔ جی ہاں! پروفیسر انصاری کو پھولوں سے بہت محبت تھی۔ وہ انہیں اولاد کی طرح چاہتے اور جب بھی انہیں کسی نئے پھول کے بارے میں پتا چلتا تو وہ فوراً کسی بے تاب بچے کی طرح اسے حاصل کرنے نکل پڑتے۔ صرف اسی پر موقوف نہیں بلکہ وہ پودوں کے متعلق علم کے ماہر بھی تھے۔ انہوں نے انواع و اقسام کے پھول پتے جمع کر رکھے تھے۔ ان پھولوں پتوں یعنی پودوں سے ان کی کئی یادیں وابستہ تھیں۔

اکثر وہ ان ننھے پودوں اور پھولوں کو یادگار بنا کر ایک بڑی سی دبیز کتاب میں رکھ دیا کرتے۔ اس کتاب کے بارے میں بہت کم لوگوں کو علم تھا۔ پروفیسر انصاری نے وصیت کی تھی کہ جب ان کا انتقال ہو جائے تو اس کتاب کو بھی ان کے ساتھ ہی دفن کر دیا جائے کیونکہ جس طرح یہ بے زبان کتاب دنیا میں ان کے ساتھ رہی ہے اسی طرح قبر میں بھی ان کے ساتھ رہے۔ لوگ ان کی اس بات پر ہنسا کرتے۔ بھلا کتاب بھی کہیں کسی کی ساتھی ہوتی ہے؟ لیکن پروفیسر انصاری کی یہ بات بالکل درست تھی۔ کتاب سے اچھا دوست اس دنیا میں کوئی نہیں۔ کتاب تنہائی میں ایک سچے اور نیک رفیق (دوست) کا کام انجام دیتی ہے۔ اچھے دوست کی طرح کتاب کا انتخاب بھی بہت احتیاط کے ساتھ سوچ سمجھ کر کرنا چاہئے۔ پروفیسر انصاری کی وہ کتاب بھی بڑی اَن مول تھی۔ سرخ چمک دار جلد والی اس کتاب کے اندر کئی سوکھے ہوئے پھول اور ننھے پودے موجود تھے۔ مثلاً جب پروفیسر نے زندگی میں پہلی بار دوستی کی تھی اور ان کی عمر فقط تین سال تھی تو اس دوستی کی نشانی ایک پتا تھی، جو اب کتاب میں رکھے رکھے سوکھ چکا تھا۔ پھر بچپن بیت گیا اور ان کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔ ایک معزز خاندان کی دوستی کی نشانی ایک خشک پھول تھا جسے انہوں نے کتاب میں محفوظ کر لیا تھا۔ پھر جب سلمٰی ان کی زندگی میں بیوی بن کر داخل ہوئی تو اس واقعے کی نشانی کنول کا ایک سوکھا پھول بنی۔ پھر پہلے بیٹے کی پیدائش پر انہوں نے گلاب کے پھول کو کتاب میں محفوظ کر لیا۔ لوگ پروفیسر انصاری کو خبطی کہا کرتے۔ کوئی ان سے طویل گفتگو کے لئے ہرگز تیار نہ تھا اور نہ ہی وہ کسی بھی ملنے والے کو خوش کرنے کے گر جانتے تھے۔ وہ ایک سرد مزاج، امن پسند اور حلیم الطبع آدمی تھے۔

روز صبح کو جب سورج طلوع ہوتا اور گلاب کی خوبصورت جھاڑیاں اور درختوں کے جھنڈ سورج کی روشنی میں چمکنے لگتے تو لکڑی کے مکان کے مکینوں میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی۔ اس صبح ناشتے کی میز پر سلمٰی بیگم

نے اپنے لڑکے سے کہا "وحید تمہارے والد صاحب آج ناشتا نہیں کریں گے؟"

وحید اخبار پر سے نظریں ہٹا کر بے زار سے لہجے میں بولا! "ممی...... کبھی پہلے ساتھ کیا ہے جو آج کریں گے؟"

"لیکن وہ ہیں کہاں؟"

"ہوں گے اپنے کمرے میں............ کل شام میں اپنے دوست کو ملوانے کے لئے لے گیا تو وہ کسی پھول پتے میں گم تھے۔ مجھے اور میرے دوست کو دیکھ کر ٹکا سا جواب دے دیا کہ کسی سے نہیں مل سکتا، ہاں اگر کوئی علمی سوال، لیکن بے حد اہم ہو تو صرف اس کا جواب دے سکتا ہوں............ ممّی............ ممّی............ میرا دوست اتنے بڑے باپ کا بیٹا ہے...... پاپا کا یہ جواب سن کر وہ مجھ سے بھی ناراض ہو گیا اور جاتے جاتے کہہ گیا کہ جب تمہارے عالم فاضل پاپا کے علم اور تجربے سے تمام دنیا فائدہ اٹھا لے اور ان کا لوہا مان جائے تو مجھے بھی بتا جانا!"

سلمٰی بیگم یہ سن کر رنجیدہ ہو گئیں۔

"لیکن بیٹے............ تمہارے پاپا بہت............"

"میں سب جانتا ہوں ممّی............ پاپا ملک کے نامور عالم ہیں۔ کئی سو کتابوں کے مصنف ہیں لیکن...... لیکن اس گھر کے لوگ ہمیشہ ان کی توجہ کو ترسے ہیں۔ ان کی دوستی تو پتوں اور پھولوں سے ہے جو ایک فرسودہ سی کتاب میں دم توڑ چکے ہیں۔ ممی............ ممی، پاپا ہم سب کو بھی پھول پتے بنا کر اس منحوس کتاب میں کیوں نہیں رکھ دیتے؟ کم از کم اس طرح ہم انہیں یاد تو رہیں گے!" وحید غصے سے کہتا چلا گیا۔ سلمٰی بیگم خاموش رہیں۔ ناشتے کی میز پر کافی انتظار کرنے کے بعد وہ پروفیسر کے کمرے کی جانب آئیں۔ "ٹھک ٹھک!" انہوں نے دستک دی۔

"کون ہے؟" اندر سے پروفیسر کی پریشان آواز سنائی دی۔

"پروفیسر صاحب ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے............"

"میں کسی ناشتے واشتے کو نہیں جانتا۔ رات بھر میں نے ایک نایاب پودے پر تحقیق کی ہے اور اب اس پر کچھ لکھ رہا ہوں۔ براہ کرم آپ تشریف لے جایئے!"

سلمٰی بیگم ناراض ہو کر واپس آ گئیں۔

پھر بہت سے دن گزر گئے۔ پروفیسر انصاری کی اس پراسرار کتاب میں کئی پھولوں اور پتوں کا اضافہ ہوتا رہا۔ جب انہیں سائنس کا عالمی اعزاز ملا تو انہوں نے داؤدی کا پھول کتاب میں رکھ دیا۔

ایک شام جب سورج غروب ہو رہا تھا تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ (Lilac) لی لیک کی خوب

سورت اور خوشبودار جھاڑیوں کے درمیان پروفیسر انصاری کا جنازہ رکھا ہوا ہے۔ جنازے کے ارد گرد ان کے بچپن کے دوست، گھر والے اور کئی افراد موجود تھے لیکن کسی کی آنکھ میں آنسو نہ تھے۔ لگتا تھا جیسے ان پر پروفیسر کی موت کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ قریب ہی وحید کھڑا تھا، جس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا اور ہاتھ میں وہ بے زبان کتاب تھی جس میں پروفیسر انصاری نے کئی یاد گاریں تعمیر کی تھیں۔ وحید ان کے ایک ایک دوست کو وہ کتاب دکھلا رہا تھا۔

"میرے اللہ.......... تو یہ ہے وہ کتاب! دنیا میں پروفیسر کی واحد دوست!" پروفیسر ضیاء نے حیرت سے اس سرخ مجلد کتاب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اچانک مشرق کی جانب سے فاختاؤں کا ایک جھنڈ نمودار ہوا۔ ان فاختاؤں کی چونچوں میں کئی طرح کے پھول اور زیتون کی شاخیں تھیں۔ تمام پرندے نہایت ادب و احترام سے پروفیسر انصاری کی لاش پر کسی بادل کی طرح چھا گئے۔ ان کی چونچیں کھل گئیں اور پھول کی پتیاں اور زیتون کی شاخیں پروفیسر کی لاش پر گرنے لگیں۔ یہ دیکھ کر پروفیسر ضیاء چونک اٹھے اور پھر گلو گیر لہجے میں وحید کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا! "بیٹے.......... اس شخص نے جس چیز کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی تھی، افسوس ہم تو اس کی قدر نہ کر سکے لیکن ان امن پسند پرندوں کا غول اس بات کی ضمانت ہے کہ آج واقعی ایک امن پسند عالم دنیا سے اٹھ گیا ہے.......... واقعی ایک امن پسند شہری ختم ہو چکا ہے.......... افسوس ..... ہم اس کے علم کی قدر نہ کر سکے، اور یہ اس کے ساتھ ہی اسکے سینے میں دفن ہو جائے گا۔ وحید..... وحید میرے بیٹے اس معاشرے میں عالم کی حیثیت اور وقعت یہی ہے کہ اس کی قدر کوئی نہیں کر پاتا۔ وہ علم جس کے حصول کے لئے اس کی تمام زندگی ضائع ہو جاتی ہے اس کے ساتھ ہی قبر میں دفن ہو جاتا ہے.......... میرے بیٹے ذرا ٹھہرو.......... پروفیسر کی ایک جھلک مجھے دیکھنے دو!" اتنا کہہ کر پروفیسر ضیاء نے لاش کے چہرے پر سے کفن ہٹایا۔ پروفیسر انصاری کا امن پسند چہرہ روشن تھا۔ پروفیسر ضیاء نے لاش کا سر آہستہ سے اٹھایا اور اس کے نیچے وہ موٹی کتاب وحید کے ہاتھ سے لے کر رکھ دی .... بے زبان کتاب! اب سب کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور سب ہی کو پروفیسر انصاری کی قدر و منزلت کا اندازہ ہو چکا تھا .... لیکن .... لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ جنازہ بالکل تیار تھا..........

لیکن وہ بے زبان کتاب سب ہی سے باتیں کر چکی تھی، سب راز بتا چکی تھی اور اب پروفیسر کے ساتھ ہی جا رہی تھی، ان کی رفیق کار بن کر ..... لیکن آج وہ بے زبان نہیں تھی، بلکہ سب سے باتیں کر رہی تھی۔ پروفیسر انصاری کی عظمت کی باتیں، وہ باتیں جو زندگی بھر پروفیسر نے اس سے کی تھیں، سب کو سنا رہی تھی، سب کو بتا رہی تھی، وہ بے زبان کتاب، جو آج بول رہی تھی، سب سے باتیں کر رہی تھی، سوکھے پھولوں اور پتوں کے ساتھ!!

(مینز کرسٹین اینڈرسن کی کہانی "دی ڈمب بک" سے ماخوذ)

مناسب دام ۔ بہت آرام

آنکھ مچولی

گھر بیٹھے پائیے

86 روپے بچائیے

آنکھ مچولی کے ۱۰ عام اور ۲ خاص شماروں کی سالانہ قیمت مع رجسٹرڈ ڈاک خرچ ۲۳۶ روپے بنتی ہے

مگر!

ممبر شپ حاصل کرنے پر ۸۶ روپے کی خصوصی بچت

آپ ہمیں ۱۵۰ روپے کا منی آرڈر روانہ کر دیجئے
ہم آپ کو سال بھر آنکھ مچولی باقاعدگی سے بھجواتے رہیں گے۔

- منی آرڈر فارم پر اپنا مفصل نام اور پتہ ضرور لکھئے۔
- دیگر ممالک کے لئے زرِ سالانہ کی شرح ۳۰۰/- روپے ہے

منی آرڈر اس پتے پر روانہ کریں

ماہ نامہ آنکھ مچولی — ڈی ۔۱۱۲، سائیٹ کراچی

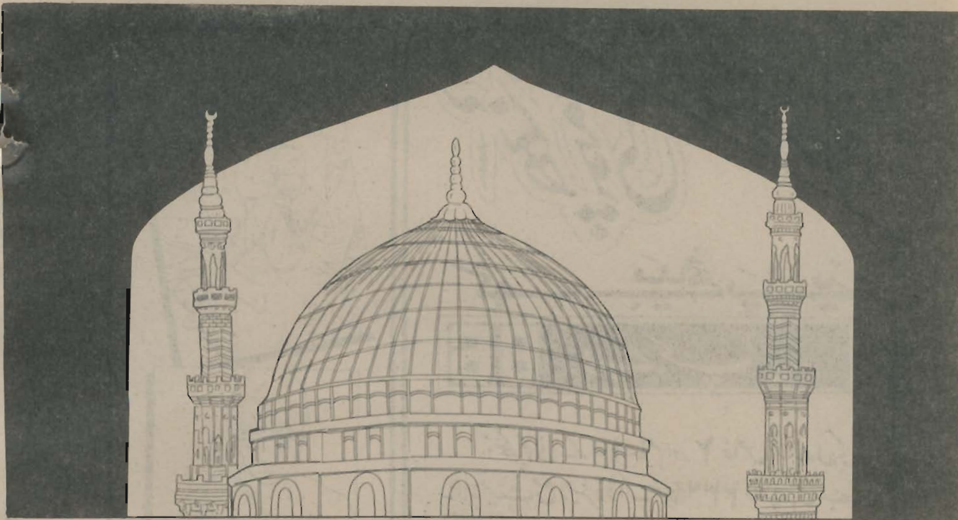

خدا سچا ہے

مرسلہ: نثار احمد

بغداد سے چالیس میل کے فاصلے پر قصبہ سلمان، ہے۔ پہلے اسے مدائن کہتے تھے۔ یہاں ایک شاندار مقبرے میں حضرت سلمان فارسیؓ مدفون ہیں اور آپ کے مزار سے متصل دو جلیل القدر صحابہ حضرت حذیفہ الیمانیؓ اور حضرت جابر بن عبداللہؓ کے مزارات ہیں۔ ان دونوں اصحاب کے مزارات پہلے سلمان سے دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک غیر آباد جگہ پر تھے۔

ہوا یہ کہ حضرت حذیفہؓ نے خواب میں ملک فیصل اول (شاہ عراق) سے فرمایا کہ ہم دونوں کو موجودہ مزاروں سے منتقل کر کے دریائے دجلہ سے تھوڑے فاصلے پر دفن کر دیا جائے، اس لئے کہ میرے مزار میں پانی اور حضرت جابرؓ کے مزار میں نمی شروع ہو گئی ہے۔

شاہ یہ خواب مسلسل دو راتیں دیکھتا رہا اور شاید بے پروائی یا انہماک امورِ سلطنت کے باعث بھول

گیا۔ تیسری رات حضرت موصوفؓ نے عراق کے مفتی اعظم کو خواب میں یہی ہدایت فرما کر کہا کہ دو راتوں سے کہہ رہے ہیں لیکن اس نے اب تک اس کا انتظام نہیں کیا، اب یہ تمہارا کام ہے کہ اسے متوجہ کر کے اس کا بندوبست کراؤ۔ چنانچہ اگلے روز صبح ہی صبح مفتی اعظم نوری السعید پاشا وزیر اعظم کو ہمراہ لے کر بادشاہ سے ملے اور اپنا خواب بیان کیا۔ شاہ نے کہا کہ وہ بھی دو راتوں سے یہی خواب دیکھ رہا ہے۔

مفتی اعظم نے مزارات کو کھودنے اور نعشوں کو منتقل کرنے کا فتویٰ جاری کر دیا اور اس کی تکمیل کے لئے شاہی فرمان میں عید قربان کے دن نماز ظہر کے بعد مزارات کھودنے کا وقت مقرر کر دیا گیا۔ بعد میں وقت دس روز کے لئے اور بڑھا دیا گیا۔ حجاز، مصر، شام، لبنان، فلسطین، ترکی، ایران، بلغاریہ، افریقہ، ہندوستان اور روس سے بے شمار عظیم شخصیتیں اس موقع پر موجود تھیں۔

دوشنبہ کے دن بارہ بجے کے بعد لاکھوں انسانوں کی موجودگی میں مزارات کھولے گئے تو معلوم ہوا کہ حضرت حذیفہؓ کے مزار میں کچھ پانی آچکا تھا اور حضرت جابرؓ کے مزار میں نمی پیدا ہو چکی تھی۔ حالانکہ دریائے دجلہ وہاں سے کم از کم دو فرلانگ دور تھا۔ تمام ممالک کے سفیر، عراقی حکومت کے تمام ارکان اور شاہ فیصل کی موجودگی میں پہلے حذیفہؓ کی نعش مبارک کو کرین کے ذریعے زمین سے اس طرح اٹھایا گیا کہ ان کی نعش مبارک کرین پر نصب سٹریچر پر خود بخود آگئی۔ اس کرین سے اسٹریچر کو علیحدہ کر کے شاہ فیصل، مفتی اعظم عراق، وزیر مختار جمہوریہ ترکیہ اور پرنس فاروق ولی عہد مصر نے کندھا دیا اور بڑے احترام سے ایک شیشے کے تابوت میں رکھ دیا پھر اسی طرح حضرت جابرؓ کی نعش مبارک کو مزار سے باہر نکالا گیا۔

نعش ہائے مبارک کا کفن حتیٰ کہ ریش مبارک کے بال تک بالکل صحیح حالت میں تھے۔ نعشوں کو دیکھ کر یہ اندازہ ہرگز نہ ہوتا تھا کہ یہ تیرہ سو سال کی نعش ہیں بلکہ گمان یہ ہوتا کہ شاید انہیں رحلت فرمائے دو تین گھنٹے سے زائد وقت نہیں گزرا۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ ان دونوں کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ان میں اتنی پر اسرار چمک تھی کہ بہتوں نے چاہا کہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھیں لیکن ان کی نظریں اس چمک کے سامنے ٹھہرتی ہی نہ تھیں۔

بڑے بڑے ڈاکٹر یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ ایک جرمن ماہر چشم جو بین الاقوامی شہرت کا مالک تھا وہ تمام کارروائی میں بڑی دلچسپی لے رہا تھا۔ اس نے یہ منظر دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ اس سے کچھ اتنا بے اختیار ہوا کہ مفتی اعظم کے ہاتھ پر فوراً اسلام لے آیا۔

اس موقع پر ایک جرمن فلم ساز کمپنی نے شاہ عراق کی منظوری سے عین مزارات کے اوپر دو سو فٹ بلند فولاد کے چار کھمبوں پر کوئی تیس فٹ لمبا اور بیس فٹ چوڑا ٹیلی ویژن اسکرین لگا دیا۔ کمپنی نے کھمبوں

کے چاروں طرف چھت سے ملحق چار اسکرین لگا دیئے۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ ہر کوئی اپنی جگہ کھڑے ہو کر مزارات کے کھلنے کے وقت سے اخیر وقت تک تمام کارروائی دیکھتا رہا۔

دوسرے دن بغداد کے سینماؤں میں اس واقعہ کے فلم دکھائے گئے۔ سینکڑوں یہودی اور عیسائی اس زندہ معجزے کو دیکھ کر مشرف بہ اسلام ہوگئے۔ اسے زیادہ عرصہ بھی نہیں گزرا۔ ۱۹۳۲ء میں اس معجزے کا ظہور ہوا۔ اسے ہر مذہب و ملت اور کئی ملکوں کی مقتدر شخصیتوں نے دیکھا ہے۔ اس کی دنیا کے اخباروں نے جلی عنوانات سے تشہیر کی ہے۔ یہ مزارات گمنام افراد کے بھی نہیں تھے۔ یہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی و امی کے دو مشہور صحابہؓ کے مزار تھے۔ جنہیں پہلے بھی لوگ جانتے اور مانتے تھے اور جواب بھی مرجع خلائق بنے ہوئے تھے۔

کیا علم، عقل، تجربہ اور سائنس کے پاس اس کا جواب ہے؟ کیا کوئی صاحب عقل جس کے دل میں ذرا سا بھی شائبہ حق و انصاف ہے، اس سے انکار کر سکتا ہے۔ یقیناً جس کے دل میں جستجوئے حق اور تلاشِ حقیقت کا جذبہ ہو گا وہ اقرار کرے گا کہ خدا سچا ہے، خدا کا دین اسلام سچا ہے اور خدا کا بھیجا ہوا آخری پیغام قرآن سچا ہے۔ (بشکریہ حکایات مجاہدین)

تضاد ———— قمر حسین کالا اسکول، نیو کراچی

دبلے پتلے وزیر صحت نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

"تمباکو نوشی صحت کے لئے مضر ہے۔"

ریلوے کے وزیر نے ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہوئے کہا۔

"ہمیں چاہئے کہ ریلوں میں سفر کریں۔"

وزیرِ ثقافت نے ٹائی درست کرتے ہوئے کہا۔

"ہمیں اپنی ثقافت کو اپنانا چاہئے۔"

"وزیرِ محنت نے اپنی کار کا دروازہ ڈرائیور سے کھلواتے ہوئے کہا۔

"محنت میں عظمت ہے۔"

اور وزیرِ مذہبی امور نے چمچہ کانٹے سے ڈنر کرتے ہوئے کہا۔

"ہاتھ سے کھانا سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔"

لکھنے سے پہلے پڑھنے کی باتیں

آنکھ مچولی کا یہ شعبہ مختصر تحریروں پر مبنی ہے۔ ضروری نہیں کہ اس میں نئے لکھنے والوں ہی کی تحریریں شامل ہوں۔ بڑی عمر کے قلم کار بھی اس حصے کے لئے مختصر تحریریں بھجوا سکتے ہیں۔

لیک بات یاد رکھئے کہ تحریر جس قدر مختصر ہوگی اس قدر جلد شائع بھی ہو سکے گی۔ اسی طرح تخلیقی یا طبع زاد تحریروں کو دوسری تحریروں پر فوقیت دی جاتی ہے۔ آپ بھی کوشش کیجئے کہ آپ جو کچھ بھی لکھیں وہ آپ کا اپنا ہو خواہ اس کا معیار کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ ادارہ آنکھ مچولی کی کوشش ہوتی ہے کہ کمزور تحریروں کو بہتر بنا کر شائع کرے۔ معلومات اور مضامین وغیرہ میں گھسی پٹی چیزیں بھیجنے سے گریز کریں۔ اس سیکشن کو بہتر سے بہتر تر بنانے کے لئے ہم آپ کی تجاویز کا خیر مقدم کریں گے۔

ماں

میم عین خان

"ماں! یہ باہر گولیاں کیوں چل رہی ہیں؟"
سہمے ہوئے لہجے میں ننھے ارمغان نے پوچھا۔
"بھارتی درندے نہتے عوام پر گولیاں برسا رہے ہیں، خدا ان کو غارت کرے۔"

ماں بڑبڑائی۔
"ماں گولی لگنے سے کیا انسان مر جاتا ہے؟"
"ہاں بیٹا!"

"ماں! یہ بھارتی فوجی روزانہ لوگوں کو کیوں مارتے ہیں؟"
"آزادی کا نام لینے پر"
"ماں کیا آزادی کا نام لینا گناہ ہے؟"
"گناہ تو نہیں البتہ بھارتی فوجوں کی نظر میں جرم ضرور ہے۔"
"ماں! جرم کیا ہوتا ہے؟"
"اپنے حقوق کے لئے لڑنا اور اپنا حق مانگنا سب سے بڑا جرم ہے؟"
"ماں! یہ آزادی کیا چیز ہے؟"
"غلامی سے نجات کا راستہ۔"
"اور یہ غلامی کیا چیز ہے؟"
"ظالم کے آگے جھک جانا۔"
"ماں! کیا ہم بھارت کے آگے جھکتے ہیں؟"
"نہیں بیٹا! ہم صرف اللہ کے آگے جھکتے ہیں، جو سب کا پالنے والا ہے، جو پورے جہاں کا مالک ہے۔"
"ماں! اس کشمیر کی وادی کا بھی اُللہ ہی مالک ہے۔"
"ہاں بیٹا! کشمیر کی وادی کا بھی اللہ ہی مالک ہے۔"
"جو مالک ہوتا ہے وہ بہت طاقتور ہوتا ہے؟"
"ہاں بیٹا!"
"ماں تو پھر اللہ تو بہت طاقتور ہو گا۔"
"ہاں بیٹا!"
"ماں! جب اللہ اتنا طاقتور ہے تو وہ ہم کشمیری مسلمانوں کی مدد کیوں نہیں کرتا؟"
"کرتا ہے بیٹا! وہی تو مظلوموں کی فریاد سنتا ہے اور جب اس کی لاٹھی برستی ہے تو بڑے بڑے چنگیز، ہلاکو، شداد، فرعون اور نمرود خاک میں مل جاتے ہیں۔"
"ماں! بھارت کب خاک میں ملے گا؟"
"بہت جلد! ظالم کا غرور خاک میں مل کے رہے گا۔ کشمیر ایک نہ ایک دن ضرور آزاد ہو گا۔ انشاء اللہ۔"

ماں نے اتنا ہی کہا تھا کہ باہر سے بھارتی فوج کی چلائی ہوئی ایک گولی سنسناتی ہوئی آئی اور ماں کے دماغ میں اتر گئی۔

سرخ سرخ لہو ماں کی پیشانی سے بہنے لگا تھا۔ ماں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی تھی۔

"ماں! ماں!!ماں!!!" ننھا ارمغان چلایا۔ ماں کی طرف سے اسے کوئی جواب نہیں ملا۔

تو بولتی کیوں نہیں؟!!! ننھا ارمغان بلک بلک کر رو رہا تھا۔

"شش........... خاموش! رو مت!"

"ایک مجاہد مکان کے اندر کود آیا۔ اس کے کاندھے پر ایک بندوق لٹکی ہوئی تھی اور ایک ہاتھ میں تھی۔

"یہ لو بندوق پکڑو!" مجاہد نے ننھے ارمغان کی طرف اپنی بندوق بڑھائی۔

"میری ماں مر گئی ہے! ابھی ابھی اس کے گولی لگی ہے!! اور تم مجھے بندوق پکڑا رہے ہو۔"

"رو مت! میری بھی ماں مر گئی ہے۔ جب میں چھوٹا سا تھا تو تب میری ماں کو بھی بھارتی فوجوں نے گولی مار دی تھی۔"

"پھر تو تم روئے ہو گے؟"

"نہیں! میں رویا نہیں تھا بلکہ میں نے ماں کا بدلہ لینے کے لئے بندوق اٹھائی تھی۔"

"تم نے اپنی ماں کا بدلہ لیا؟"

"صرف اپنی ہی ماں کا نہیں بلکہ بہت ساری ماؤں کا بدلہ لیا اور تمہیں معلوم ہے دوست! یہ کشمیر کی وادی بھی اپنی ماں ہے۔ ہمیں اس کا بدلہ بھی لینا ہے۔"

"میں بھارتی فوجوں سے صرف اپنی ماں ہی کا نہیں ساری ماؤں کا بدلہ لوں گا۔ لاؤ یہ بندوق مجھے دے دو۔" ننھے ارمغان نے بندوق پکڑلی۔

مجاہد نے زخمی مسکراہٹ کے ساتھ ننھے ارمغان کی طرف دیکھا جیسے اس کے روپ میں خود اپنا بچپن دیکھ رہا ہو۔

اللہ مجھ کو پیڑ بنا

عقیل سروہی، مرسلہ: محمد شبیر احمد خان، کراچی

اللہ مجھ کو پیڑ بنا
جس کا ہو گہرا سایہ
تھکے مسافر آ بیٹھیں
میری ٹھنڈی چھاؤں میں
یا پھر مجھے دِیا بنا
تاریکی میں مجھے جلا
جو راہی رستہ بھولے
سیدھی راہ وہ پا جائے
اللہ! سن لے میری دعا
پیڑ بنا یا دِیا بنا

ذرا بتایئے تو!

مرسلہ: عظیم۔ کورنگی نمبر ۲

(۱) حضرت فاطمہ زہرا‌رض نے رخصتی کے وقت حضور ؐ کے کس اونٹ پر سواری اختیار کی تھی؟

(۲) غزوہ احد میں مسلمانوں کے پاس فقط دو گھوڑے تھے، ایک حضور ؐ کے پاس اور دوسرا حضرت ابوبردہ‌رض کے پاس، کیا آپ ان دونوں گھوڑوں کے نام بتا سکتے ہیں؟

(۳) صلیبی جنگوں کے دوران صلاح الدین ایوبی نے رچرڈ کی کس گھوڑی کے مرنے پر اپنی گھوڑی بطور تحفہ بھیجی تھی؟

---

(۱) اشہب۔ (جوابات) (۲) سکب اور ملاوح (۳) فیوڈل

تضاد

غلام مرتضیٰ، ملیر

"۱۴ اگست کے دن آپ کیا کرتے ہیں؟"

اس دن جناب ہم اپنے گھر پر پاکستان کا جھنڈا لگاتے ہیں، اپنی کار پر پاکستان کا جھنڈا

لگاتے ہیں، ہمارا بچہ بھی اپنی سائیکل پر پاکستان کا جھنڈا لگا کر پورے محلے کا گشت کرتا ہے۔ ہم اپنے گھر کو پاکستانی جھنڈیوں سے سجاتے ہیں۔"

واہ صاحب! لگتا ہے آپ سچے پاکستانی ہیں۔ آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟"

"جی ہاں۔ میرا نام جمی ہے!"

"جمی! شاید جمیل"

"نہیں جی محمد جمشید لیکن میں اپنے نام کے ساتھ ایم۔ جے لکھتا ہوں اور سب لوگ مجھے جمی کے نام سے پکارتے ہیں۔"

"یہ جو آپ کے ہاتھ پر گھڑی بندھی ہے۔ بڑی خوبصورت ہے......"

"جی ہاں! یہ فرانس کی بنی ہوئی ہے۔ میرے ماموں نے مجھے گفٹ میں بھیجی تھی۔"

"اور یہ کپڑا تو آپ نے بڑا زور دار پہنا ہوا ہے۔ یقیناً پاکستان کا بنا ہوا لگتا ہے!"

"نہیں جی! یہ جاپان کا بنا ہوا ہے۔ میرے تقریباً تمام جوڑے جاپانی یا فرانسیسی کپڑے کے بنے ہوتے ہیں۔"

"اچھا یہ جوتا جو آپ پہنے ہوئے ہیں، یہ تو یقیناً پاکستان کا بنا ہوا ہو گا۔"

"نہیں جی! یہ جوتا تو امریکا کا بنا ہوا ہے۔"

"کیا آپ پاکستان سے محبت کرتے ہیں؟"

"جی ہاں جناب! آپ دیکھ نہیں رہے میں نے اپنے سینے پر دل دل پاکستان کا بیج لگایا ہوا ہے۔"

"اگر آپ واقعی پاکستان سے محبت کرتے ہیں تو پاکستان کی بنی ہوئی چیزوں کو کیوں ترجیح نہیں دیتے؟"

"ارے صاحب! آپ کو معلوم نہیں پاکستان کی قوم بڑی بے ایمان ہے۔ غیر معیاری اور ناپائیدار چیزیں بنا کر بیچتی ہے۔ اس لئے ہم پاکستان کی بنائی ہوئی چیز نہیں خریدتے۔"

"ہمیں تو آپ کے پاکستانی ہونے پر شبہ ہو رہا ہے۔ اپنے قول و فعل میں تضاد تو نہ رکھیں!"

"لاحول ولا قوۃ! آپ ہمارے پاکستانی ہونے پر شک کر رہے ہیں۔ صاحب! ہم سے زیادہ کوئی پاکستانی نہ ہوگا۔ ہم سچے پاکستانی ہیں!!!"

ان اسلامی ممالک کے نام جنہوں نے ماہ اگست میں آزادی حاصل کی۔

ملک کا نام	سن
پاکستان	۱۴ اگست ۱۹۴۷ء
بحرین	۱۵ اگست ۱۹۷۱ء
افغانستان	۱۸ اگست ۱۹۱۹ء
انڈونیشیا	۱۷ اگست ۱۹۴۵ء
چاڈ	۱۱ اگست ۱۹۶۰ء
دھومی	یکم اگست ۱۹۶۰ء
نیجر	۱۳ اگست ۱۹۶۰ء
سینی گال	۲۰ اگست ۱۹۶۰ء

دوستی

مرسلہ: ظفر عیسیٰ بلوچ، کوئٹہ

دو دلوں کے ملاپ اور خیالات و نظریات کی یکسانیت کا نام دوستی ہے۔ دوستی کے مفہوم کو گر صحیح طور پر سمجھ لیا جائے تو یہ ایک لازوال نعمت ثابت ہوتی ہے دوستی کو مضبوط اور قائم رکھنے کے لئے اپنے دل کو بہت وسیع رکھنا پڑتا ہے۔ دوستی کو مطلب پرستی اور خود غرضی سے پاک ہونا چاہئے۔

دوستی ہی ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان کو انسان سے محبت کرنا، ایک دوسرے کا احترام کرنا اور ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھنا سکھاتا ہے۔

کہاں سے کہاں تک

مشکلوں سے پڑھنے بیٹھا تو یاد آیا کہ میرے قلم میں سیاہی ختم ہو چکی ہے سیاہی بھرنے اٹھا، سیاہی بھری۔ دوات کو بند کرتے ہوئے اس کے نیچے پڑے صفحات پر نظر پڑی تو میں نے صفحات کو اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد صفحات میں سے عید کارڈ نکل آیا جو میرے ایک قریبی دوست کا تھا۔ یاد آیا کہ ابھی تک اس کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ شکریئے کا خط لکھنے کے لئے جیب سے قلم نکالا تو وہ ہاتھ سے چھوٹ کر جوتے میں جا گرا۔ جوتے سے قلم نکالتے وقت یاد آیا کہ ابھی تو جوتا پالش کرنا ہے، چنانچہ پالش اور برش ڈھونڈنے لگا۔ پالش تو مل گئی لیکن برش کرتے ہوئے ایک ڈائجسٹ ہاتھ آگیا۔ ڈائجسٹ پرانا تھا۔ تجسس سے اس کو کھولا اور کہانیوں کے نام پڑھنے لگا۔ ایک نام اچھا لگا تو سوچا اس کو پڑھ لوں۔ صفحات پلٹتے ہوئے ایک لطیفے کو پڑھنے لگا۔ لطیفہ پڑھ کر یاد آیا کہ پہلے پڑھا ہے۔ کہاں؟ یاد نہیں۔ ہاں تصویر والی کاپی میں

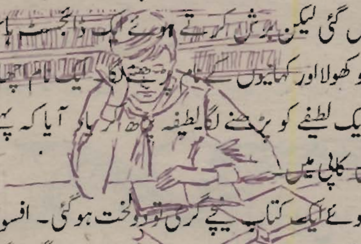

کاپی ڈھونڈتے ہوئے ایک کتاب نیچے گری تو دولخت ہو گئی۔ افسوس کے ساتھ کتاب کو اٹھایا۔ کیل سے سوراخ کر کے نیا دھاگہ ڈال رہا تھا کہ ہتھوڑی انگلی پر لگ گئی۔ میں پورے کمرے میں ہاتھ بغل میں دبا کر اور ایک ٹانگ اٹھا کر ناچنے لگا۔ پٹی کروانے باہر جانے لگا تو انگوروں کی بیل پر نظر پڑی جس کو بھائی جان کا چہیتا مرغا مشقِ ستم بنا رہا تھا۔ میں مرغے کے پیچھے بھاگا تاکہ مرغا پکڑوں۔ کم بخت کچن میں جا گھسا تو دو پلیٹیں اور ایک کپ توڑنے کے بعد ہاتھ آیا۔ مرغ کو دو چار جوتے مارے تو گردن نکال نکال کر عجیب غریب آوازیں نکالنے لگا۔۔ کم بخت کہیں مر ہی نہ جائے۔ یہ سوچ کر چھوڑ دیا۔ ”ارے بھئی دودھ لے آؤ۔“ باجی جان نے حکم دیا تو میں برتن اٹھا کر باہر نکل آیا۔ راستے میں سوچا آکر پڑھوں گا۔

ہاتھ پر بندھی گھڑی میں ٹائم دیکھا تو شام کے پانچ بج رہے تھے۔

”افوہ! کہاں ایک بجے پڑھنے بیٹھا تھا اور کہاں شام کے پانچ بج گئے۔“ کچھ ہی دیر

بعد میں دودھ کے باڑے پر کھڑا گوالے سے دودھ لیتے ہوئے سوچ رہا تھا۔
"کوئی کام دل لگا کر اور منصوبہ بنا کر نہ کیا جائے تو یہی ہوتا ہے۔"

یاد رکھیں

مرسلہ: سنتوش کمار، زرادھائل ڈھاڑ

- ...... دنیا میں رہنا مشکل نہیں بلکہ دنیا کی مشکلات سے ٹکرانا مشکل ہے۔
- ...... دنیا ایک سرائے ہے۔ یہاں لاکھوں لوگ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں لیکن سرائے بدستور وہی رہتی ہے۔
- ...... انسان کیا ہے؟ ایک مٹی کا حقیر پتلا۔ ٹھوکر لگنے پر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جاتا ہے، اس لئے اس مٹی کے پتلے کو اس پتھر کی دنیا میں دھیان سے چلنا چاہئے۔
- ...... سکون چاہتے ہو تو ہر برائی سے دور رہو۔
- ...... دلوں کو جبر و تشدد سے نہیں، پیار و محبت سے جیتا جا سکتا ہے۔

انمول موتی

مرسلہ: محمد فیصل فاروقی، دستگیر

کُفر کے بعد سب سے بڑا گناہ دل دکھانا ہے۔
(حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم)

مصیبت میں گھبرانا سب سے بڑی مصیبت ہے۔
(حضرت علی کرم اللہ وجہ)

کلام میں نرمی اختیار کرو، لہجے کا اثر الفاظ سے زیادہ ہوتا ہے۔
(امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ)

بیوقوفوں کی طرح سوال کرو اور عقلمندوں کی طرح یاد رکھو۔
(ابراہیم بن مہدی)

منہ نہ بنائیے

سبزیاں بھی کھائیے

ہماری صحت کا دارومدار ہماری پسندیدہ غذاؤں پر نہیں بلکہ غذاؤں کے متوازن انتخاب پر ہے۔

گوشت، انڈے، دودھ دھی، دالیں اور چاول شوق سے کھائیے

مگر ـــــ سبزیوں سے جی نہ چرائیے

★ ـــــ سبزیاں ہمارے جسم کو بیماریوں سے مدافعت کی قوت عطا کرتی ہیں

★ ـــــ سبزیوں میں پوشیدہ قوت جزوِ خون بن کر ہمیں صحت مند رکھتی ہے

★ ـــــ سبزیاں ہلکی غذا ہونے کے باعث جلدی ہضم ہو جاتی ہیں
یوں گویا سبزیوں کا استعمال ہمارے نظامِ ہضم کو متاثر نہیں کرتا۔

★ ـــــ سبزیوں میں وٹامنز، گلوکوز اور منیرلز جیسی طاقت کے خزانے پوشیدہ ہیں

★ ـــــ سبزیاں اللہ کی بے پایاں نعمتوں میں سے ہیں

کفرانِ نعمت نہ کیجئے　　سبزیاں شوق سے کھائیے　　ہمیشہ صحت مند رہئے

یہ اشتہار ماہنامہ آنکھ مچولی کراچی نے بقائے صحت اور بہبودِ اطفال کی خاطر بطورِ خاص شائع کیا

قلمی دوستی کے سلسلے "ساتھی بچپن کے" میں شرکت کا کوپن

نام ____________ عمر ____________

کلاس ____________ پسندیدہ مضمون ____________

مستقبل کا خواب ____________

اسکول ____________

گھر کا پتہ ____________

تصویر اس سائز میں ہو۔

آپ کے نزدیک "دوستی" کا مفہوم کیا ہے۔ (ایک سطر میں) ____________

آنکھ مچولی کا سالانہ خریداری کا کوپن

نام ____________

مہینہ جس سے رسالہ شروع کروانا چاہتے ہیں ____________

رقم ____________ بذریعہ ____________

پتہ ____________

فون نمبر ____________

جون ۱۹۹۲ء کے شمارے میں "قلم قتلے" میں شائع ہونے والی کاشف عزیز کی تحریر "نیا سبق" نقل شدہ ہے۔ مذکورہ مصنف کو بلیک باکس کیا جاتا ہے۔ ثبوت فراہم کرنے پر ادارہ جنید عالم حیدرآباد جمشید عالم ٹیکسلا اور سلیم خالق کراچی کا ممنون ہے۔ (ادارہ)

بچپن کے ساتھی

کامران اعجاز بلوچ ۱۴سال نہم
بیالوجی ڈاکٹر گورنمنٹ ماڈل
اعجاز حسین خان پوسٹ بکس ۴، بھکر

انوارالحق خان بلوچ ۱۳سال دہم
حساب پائلٹ گورنمنٹ ٹیکنیکل
بہاولپور روڈ نمبر ۱

محمد قاسم بٹ ۱۵سال دہم
ریاضی پولیس آفیسر پاک بحرین اسکول
پوسٹ بکس نمبر ۲۸۸۶۳ رفاع بحرین

ظفراللہ ۱۲سال ہفتم
سائنس سائنسدان گورنمنٹ ٹیکنیکل
آبادی مہروزیر گلی ۳، نوشہرہ روڈ گوجرانوالہ

توقیر احمد طور ۱۱سال ششم
انگلش آرمی کمانڈو اوکاڑہ کینٹ
بی' این - ۶۷ گلشن اسحاق کالونی رینالہ

محمد ذوالفقار احمد ۱۰سال پنجم
کمپیوٹر انجینئر ہیپی ہوم اسکول
۳۱ جناح سوسائٹی بلاک ۸/۶ ایم اے مینی روڈ کراچی

محمد احمد خان ۱۳سال ہشتم
حساب انجینئر ٹل فاکس
۷/۱۲ نیو کراچی ۵/ڈی کراچی ۳۶

واجد علی شاہ ۱۳سال ہشتم
انگلش پائلٹ گورنمنٹ ہائر سیکنڈری
محلہ سیداں گاؤں چمکنی پشاور

آصف علی ۱۳سال ہشتم
اسلامیات گورنمنٹ ایگرو بوائز ٹیکنیکل
۸۵۱/۱۹ النور سوسائٹی ایف بی ایریا کراچی

معین الدین ۱۲سال ہفتم
سائنس اچھا شہری نیو شاہین گورنمنٹ
مکان ۹۰ بی گلی ۳ غازی نگر صدیق وہاب روڈ کراچی

محمد اشراق ۱۲سال ہشتم
حساب ڈاکٹر گورنمنٹ (N) ہائی
۴۵/الف محمدی مسجد گول بلڈنگ حیدرآباد

کہنا بڑوں کا مانو
نٹ کھٹ عینی کی شرارتوں کی رنگین باتصویر کہانی
دیکھو عینی! میں نے تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے کہ کھیلنے کے بعد کھلونے اُٹھا کر رکھ دیا کرو۔ یہ کام دوسروں کے لیے نہ چھوڑ دیا کرو۔
GULP
اُف میرے خُدا! میں نے تم کو منع کیا تھا کہ گرم چولہے کو ہاتھ مت لگانا۔ اُنگلی جل گئی نا!
EE-OUCH!
اسی لیے میں نے تم سے کہا تھا کہ دوسرے بچّوں سے لڑتے جھگڑتے نہیں ہیں ورنہ وہ تمہارے ساتھ نہیں کھیلیں گے۔
کوئی بھی تو میرے ساتھ نہیں کھیلتا
اچھا! تو بچّوں سے یوں دوستی ہوتی ہے!
ابّو نے سائیکل مجھ سے واپس لے لی ہے۔ غلطی میری ہی ہے۔ انہوں نے سڑک پہ سائیکل چلانے کے لیے منع کیا تھا۔ میں نے اُن کی بات نہیں مانی۔ لیکن اب میں ایسا نہیں کروں گی۔

پیارے بچو! تم نے عینی کی کہانی پڑھ لی۔ اب تم سچ سچ بتاؤ کہ ممّی اور پاپا جو بچوں کو روکتے ٹوکتے
ہیں تو کیا وہ غلط کرتے ہیں؟ کیا عینی کی طرح دوسرے بچوں کو بھی ان کا کہنا نہیں ماننا چاہیے؟
یاد رکھو! ماں باپ کو اپنے بچوں سے پیار ہوتا ہے اور وہ ان ہی کے بھلے کے نصیحتیں کرتے ہیں۔
وہ بچے جو اپنے والدین کا کہنا مانتے ہیں وہ دُنیا میں ترقی کرتے ہیں اور جو نہیں مانتے وہ سب
سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔

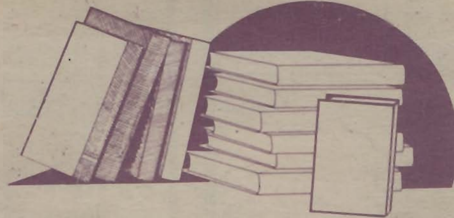

مغربی ادب

مرسلہ: شاہد انور شیرازی، مردان

(۱) ...... کونسا مغربی ادیب ناول لکھتے وقت، نیلا کاغذ، شعر لکھتے وقت زرد کاغذ اور مضامین لکھتے وقت گلابی کاغذ استعمال کرتے تھے؟

(۲) ...... مغربی ادب میں جاسوسی ناول نگاری کا بانی کسے کہا جاتا ہے؟

(۳) ...... فرانس کا بہترین مختصر کہانی نویس کسے کہا جاتا ہے؟

(۴) ...... کس مشہور ادیب کے آٹو گراف کی قیمت ان کی زندگی میں بیس پونڈ تھی؟

(۵) ...... مشہور انگریزی نظم "لندن" کے خالق کا نام بتایئے؟

(۶) ...... برطانیہ کا کون سا مشہور اخبار ۱۸۷۵ء سے مسلسل شائع ہو رہا ہے اور اس کا ابتدائی نام کیا تھا؟

(۷) ...... دنیا کی سب سے زیادہ لکھنے والی خاتون ادیب کا نام بتایئے؟

(۸) ...... دنیا کا سب سے تیز ناول لکھنے والا کون تھا؟

(۹) ...... تیسرا ایٹم بم کس ادیب کو کہتے ہیں؟

(۱۰) ...... کون سا ادیب ماڈرن روسی لٹریچر کا بانی کہلاتا ہے؟

جوابات مغربی ادب

(۱) الیگزینڈر ڈوماز (۲) ایڈ گر ایلن پو (۳) گار ساو تاسی (۴) جارج برنارڈ شا (۵) ڈاکٹر سیموئیل جانسن (۶) اخبار کا نام "دی ٹائمز" ابتدائی نام "دی ڈیلی یونیورسل رجسٹر" (۷) ارسلا بلوم (۸) ارل سٹینلے گارڈنر (۹) الیگزینڈر سولر نیٹسن (۱۰) الیگزینڈر پشکن۔

Montgomery
tea time
Montgomery
Montgomery
Montgomery
The Height of Delight!

REGD. No. M-266 AUGUST 1992

MONTHLY AANKH MICHOLEE KARACHI